مجتبیٰ حسین

اور فن مزاح نگاری

حسن مثنیٰ

مجتبیٰ حسین

اور

فن مزاح نگاری

حسن مثنّٰی

مجتبیٰ حسین
اور
فن مزاح نگاری

حسن مثنّٰی

aliapublications@hotmail.com.

MUJTABA HUSSAIN
AUR
FAN-E- MAZAH NIGARI

نام کتاب: مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری

مصنف: حسن مثنّیٰ

ای میل: hasan_mosanna@rediffmail.com

تعداد: ۴۰۰

ناشر: ایلیا پبلی کیشنز مکتبہ ایلیا۔ دہلی

سال اشاعت: ۲۰۰۳ء

کمپوزنگ: ممتاز اعظمی

سرورق: محمد حسن

طباعت: نیولائن پروسس۔ دہلی۔ 6

قیمت: ۲۰۰ روپے

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ممبئی۔ علی گڈھ

ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڈھ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت دہلی۔ ۶

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

نصرت پبلیشرز، امین آباد، لکھنؤ

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴

دانش محل، جھنڈے والا پارک، لکھنؤ

ادارہ اصلاح، مرتضیٰ حسین روڈ، لکھنؤ

حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد

انتساب

امی ڈیڈی اور ان کے والدین کی خدمت میں جن کی
دعاؤں نے مجھے اس قابل بنایاکہ میں ان کے
خوابوں کوشرمندۂ تعبیر کرسکا۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

فہرست

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

پیش لفظ

مجتبیٰ حسین اُردو کے صف اول کے مزاح نگار، کالم نویس اور خاکہ نگار ہیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں 'مزاح برائے مزاح' نہیں ہے بلکہ مزاح ان کی شخصیت میں رچ بس گیا ہے۔ وہ ایک بے حد شائستہ، نفیس اور مہذب انسان ہیں۔ ان کے لیے کسی کا دل دُکھانا تو بہت دور کی بات ہے، وہ کسی کو ایک سخت بات بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہی تہذیبی نفاست اور شائستگی ان کی تحریر میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ مزاح پیدا کرنے کے لیے واقعات کو توڑتے مروڑتے نہیں اور نہ اجنبی اور غیر مانوس الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بہت سیدھے اور سادہ انداز میں بڑی معصومیت کے ساتھ کسی واقعے کو بیان کردیتے ہیں اور پڑھنے یا سننے والے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ ان کی یہی معصومیت ان کے مزاح کا راز ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ ان کے لسانی رویے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر اردو کے مزاحیہ ادب کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ کچھ لوگ مزاحیہ الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ لوگ مزاحیہ (Situation) سے لوگوں کو ہنساتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری اور عام مزاح نگاری میں یہی فرق ہے کہ مجتبیٰ حسین مزاح کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ سن کر ہنسی آجائے۔ یہ ان کے اسلوب کی خوبی ہے۔ ان کے جملے بہت سادہ اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ کسی بات کے لیے ایسی اور اتنی بے ساختہ مثال دیتے ہیں کہ سننے والا اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ پاتا۔

مجتبیٰ حسین نے شخصی خاکے لکھے ہیں، اخبار کے کالم بھی، انشائیہ بھی اور سفرنامہ بھی اور ان

سب میں انہوں نے اتنے فن کارانہ انداز میں جزئیات کو بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا خود اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ ان کے سفرنامے اور خاص طور پر 'جاپان چلو جاپان چلو' تو اُردو کے مزاحیہ سفرناموں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ یہ آپ کو جاپان کے بارے میں وہ ساری معلومات فراہم کرتا ہے جو کسی بھی ملک کے لیے ایک شخص جاننا چاہتا ہے۔ اس میں شخصیتوں، علاقوں، اداروں، وہاں کی تہذیب اور کلچر کو جس انداز میں متعارف کرایا گیا ہے، اس کا بیان کچھ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کا قاری ذرا دیر میں ہنستے بولتے اور خوش گپیاں کرتے پورے جاپان کی سیر کر کے واپس آجاتا ہے اور اسے محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس نے اتنا بڑا سفر طے کر لیا۔

مجتبیٰ حسین مزاح نگار ضرور ہیں۔ ان کے یہاں بہت تیکھا طنز بھی ملتا ہے لیکن ان کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ ان کے خاکوں اور دوسری تحریروں میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور یہی تہذیبی نفاست ہے جو ان کے ہم عصر مزاح نگاروں میں ہی نہیں، اُردو کے مزاحیہ ادب میں انہیں ممتاز کرتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ حسن مثنیٰ نے ''مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری'' تصنیف کر کے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ حسن مثنیٰ ادب کے ایک سنجیدہ طالب علم ہیں۔ انہوں نے بڑی محنت سے ادب کا مطالعہ کیا ہے اور خاص طور پر اردو کے مزاحیہ ادب کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اس کام سے مجتبیٰ حسین کی طنز و مزاح نگاری کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اس موضوع پر کام کرنے کے لیے نئے گوشے سامنے آئیں گے۔ میں حسن مثنیٰ کو ان کی اس ادبی کاوش کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی کتاب ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی۔

پروفیسر شارب ردولوی

لکھنؤ

۱۲؍ جولائی ۲۰۰۳ء

اعتراف

عالمی ادب میں طنز و مزاح کے ابتدائی عناصر یونانی اور لاطینی زبانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں، جس کی تقلید یوروپ میں کافی عرصے بعد کی گئی، جس کے بعد انگریزی کا طنزیہ و مزاحیہ ادب انہیں کے وضع کردہ اصولوں پر استوار ہوا مگر مشرق میں بہت بعد تک اس صنف پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم طنز و مزاح کے میدان میں تقابلی اعتبار سے بہت آگے نہیں ہیں۔ یہ تو شکر کیجئے کہ اودھ پنچ کے قلم کاروں نے اس صنف کو بڑی محنت سے پروان چڑھایا اور اسے غیر افسانوی نثر میں نمایاں مقام دلانے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح آج ہم رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، ابن انشا، کنہیالال کپور، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا اور یوسف ناظم جیسے طنز و مزاح نگار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کی تخلیقات عالمی ادب کی ہمسری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

طنز و مزاح کے الفاظ اکثر و بیشتر ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے ممتاز و ممیّز ہیں۔ مزاح انسانی کمزوریوں اور خامیوں کی اصلاح کا ایک خوش گوار، ہمدردانہ اور ناصحانہ طرز عمل ہے جو ہمدردی، انس اور مفاہمت کا رہینِ منت ہے۔ اس کے ذریعہ انسان کو اس کے معائب کا تمسخرانہ طور پر احساس دلا کر اصلاحی تدابیر کی جاتی ہیں اور خامیوں اور خرابیوں کے ازالہ کا موقع فراہم کیا جاتا ہے تاکہ وہ ایک بہتر انسان بن سکے۔ مزاح کو حس لطیف کہا گیا ہے۔ اس سے روح کو تازگی اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس طنز ایک اصلاحی عمل ہے بلکہ ایک ایسا حربہ ہے جو شگفتہ مزاجی کے بغیر کارگر نہیں ہو سکتا۔ شاید اسی لیے اس میں

مزاح کی چاشنی کا ہونا ضروری ہے۔ تیکھے طنز کی تلخی اور زہرناکی' مزاح کی شیرینی اور لطافت کے بغیر کام ودہن کی آزمائش کا سبب بن جاتی ہے یعنی دونوں ہی میں اعتدال وتوازن شرط ہے۔ طنز حد سے گزرا تو وعظ ونصیحت کے زمرے میں شامل ہو گیا اور اگر مزاح کا پلہ بھاری ہوا تو ابتذال پر محمول کیا جانے لگا۔

طنز ومزاح ایک ایسا اسلوب لیے ہوتا ہے جس میں مزاح نگار کے بغض وعناد' عداوت و عصبیت کے حصار میں آ جانے کی پوری گنجائش ہوتی ہے لیکن جب ایک فن کار ان خامیوں سے بالاتر ہو جاتا ہے اور اپنی حسِ ظرافت اور تنقیدی صلاحیت سے کام لینے لگتا ہے تو وہ فن کی بلندیوں پر کمندیں ڈال سکتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے بیشتر فن پاروں میں اسی قسم کے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں جو انہیں ان کے ہم عصروں میں منفرد وممتاز قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔ میری نظر میں ان کا فن سادگی اور عجز وانکسار کا مجموعہ ہے جس میں نہ صرف عصری حسیت اور اس عہد کی دانشوری کو سمویا گیا ہے بلکہ اردو ادب کو ایک انوکھے اور بے مثل اسلوب سے بھی آشنا کرانے کی کوشش کی گئی ہے جس کی بنیاد خلوص اور درد مندی سے لبریز جذبات پر رکھی گئی ہے۔ انہوں نے اپنی تمام تخلیقات میں لفظوں کے بطن میں آباد معنویت کا ایک ایسا جہانِ نادیدہ قاری کے سامنے رکھ دیا ہے جو پرت در پرت کھلتا چلا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں برصغیر ہندوپاک میں ایک عظیم طنز ومزاح نگار بلکہ اس صنف کا امام مانا جانے لگا ہے۔

اس کی خالص وجہ شاید یہ ہے کہ وہ فن برائے فن یا تخلیق برائے تخلیق کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی تقریباً سبھی تخلیقات میں کاوش اور جاں سوزی کا عمل دخل ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنی تحریر کو نکھارنے اور سنوارنے میں ہر ممکن احتیاط کو بروئے کار لاتے ہیں تاکہ اپنے بیان کو سلیس وشستہ بنائے رکھیں۔ مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں ہمیں تکلف' تصنع یا تکرار کی آمیزش نظر نہیں آتی بلکہ وہ بے حد نرمی سے اپنی بات کہہ جاتے ہیں جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے کسی کی دلآزاری نہیں کرتے' ایذا نہیں پہنچاتے اور نہ ہی پھبتیاں کستے ہیں بلکہ انتہائی متانت اور سنجیدگی سے تہذیب کے دائرے میں رہ کر اپنی بات کہہ جاتے ہیں جو کسی پر گراں نہیں گزرتا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اختصار سے اپنا مدعا بیان کرنے کے قائل ہیں اور اختصار کے باوجود بھی جو کچھ کہنا چاہتے ہیں' کہہ جاتے ہیں یعنی

اپنے قارئین کو تشنہ نہیں چھوڑتے کہ ان میں مایوسی گھر کر جائے۔ میرے خیال میں ان کی یہ خصوصیت ان کی انفرادیت بھی ہے جو کم نثر نگاروں میں خصوصاً مزاح نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو خیالی دنیا کی سیر نہیں کراتے بلکہ اپنی تمام تحریروں میں کچھ اس قسم کے کردار و واقعات کا انتخاب کرتے ہیں جو زمین سے جڑے ہوتے ہیں اور زمینی حقائق کی نشان دہی کرتے ہیں جن میں وہ دنیا و جہاں کے تلخ و ترش تجربات سے ہمیں متعارف کرانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں پڑھتے وقت قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کے یہاں آمد ہی آمد ہے' آورد کا گزر نہیں۔ ان کی تحریروں کا خاص وصف یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ہمیشہ کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہوتا ہے جسے وہ بڑی عاجزی اور انکساری سے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے سچائی اور راست گوئی اور دوسروں کی مدد کرنے کو اپنی زندگی کا شیوہ بنالیا ہے' جس پر وہ آج بھی قائم ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت غیبت اور دوسروں کی عیب جوئی سے احتراز ہے' جس کی چھاپ ان کی تخلیقات میں بھی جا بہ جا دیکھنے کو ملے گی۔

میں نے اس تصنیف ''مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری'' کے تحت ابھی تک شائع شدہ ان کی سبھی تخلیقات (کالموں' مزاحیہ مضامین' خاکوں اور سفرناموں) کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے اور اسے آٹھ ابواب میں منقسم کیا ہے' جس میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کے فن پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی جائے کہ ان کے ادبی سفر کا مکمل احاطہ ہو سکے مثلاً انہوں نے سب سے پہلے اپنے ادبی سفر میں کالم نگاری شروع کی۔ اس لیے سوانح کے بعد سب سے پہلے بہ حیثیت کالم نگاران کے فن کو پرکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ دوران کالم نگاری انہوں نے ''ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' مزاحیہ شہ پارہ لکھا' اسی مناسبت سے ''مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا تنقیدی مطالعہ'' تیسرا باب قائم کیا گیا۔ اسی اثنا میں انہوں نے حکیم یوسف حسین خاں کا فرمائشی خاکہ لکھا تھا' جس کے پیش نظر ان کی خاکہ نگاری کو چوتھے باب میں جگہ دی گئی اور دوران ملازمت (N.C.E.R.T) جب انہیں جاپان کے سفر کا موقع ملا تو انہوں نے جاپان چلو جاپان چلو سفرنامہ لکھا۔ اسی مطابقت سے اس کتاب کا پانچواں باب سفرنامے کے جائزے پر مبنی ہے۔ چھٹے باب میں ان کی انفرادیت سے بحث کی گئی ہے جب کہ ساتواں باب مجتبیٰ حسین مشاہیر اور

احباب کی نظر میں ہے جو ان کے متقدمین، متاخرین و معاصرین کی آراء پر مشتمل ہے۔ آخر میں عکس اور آئینے کے عنوان سے ایک باب قائم کیا گیا ہے جس میں چند نادر تصاویر دی گئی ہیں۔ اس طرح یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس فن کار کی فنکارانہ صلاحیت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی جائے جیسے کہ اس کا فن ارتقا پذیر ہوا۔ آخر میں ان کتابوں کی فہرست شامل ہے جس سے میں براہ راست یا بالواسطہ مستفیض ہوا ہوں۔

یہ تصنیف ہرگز پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتی اگر ہمارے شفیق استاد ایس۔ ایم۔ عباس شارب رُدولوی اپنے قیمتی مشوروں، عنایات اور توجہات سے نہ نوازتے۔ یہ ان کی حوصلہ افزائی، قیادت اور رہنمائی کا ثمرہ ہے کہ آج میں اس قابل ہو پایا ہوں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں کیوں کہ اس موقع پر وہ تمام الفاظ بونے معلوم ہو رہے ہیں جو اظہار تشکر کے لیے رائج ہیں۔ یوں بھی میں اس ماحول میں پلا بڑھا ہوں جہاں بزرگوں کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے ان کی عظمت اور ذہنی کشادگی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

راقم الحروف ہر لحہ اپنے آپ کو اپنے والدین کے قدموں پر سر رکھا ہوا محسوس کرتا رہے گا جن کے ہاتھ ہمیشہ دعائے نیم شبی میں ہماری کامیابی و کامرانی کے لیے بلند رہتے ہیں۔ اس موقع پر اپنی چہیتی بہن کی عظمت کا اعتراف بھی لازم ہے جس نے اپنے سارے خواہشوں اور ارمانوں کو ہم بھائیوں پر قربان کر دیا اور ہمیشہ بارگاہ ایزدی میں ہم سبھی کی کامیابی، کامرانی اور سرفرازی کی دعا کرتی رہتی ہے۔ یہ اسی کی دعاؤں کا اثر ہے۔ اس موقع پر میں اپنے ناقد اور لائق احترام بھائی کے لیے دعا گو ہوں جس نے دور رہ کر بھی اپنی قربت کا احساس دلانے میں کوئی کوتاہی نہ کی اور جلد از جلد کتاب شائع کرانے کی تحریک دیتے رہے۔ ساتھ ہی اپنے نہایت عزیز بھائیوں زہیر حسن (علیگ) اور محمد حسن کے لیے دست بہ دعا ہوں جنہیں میرے اس کام کے مکمل ہونے کی سب سے زیادہ فکر تھی، خدا انہیں علم کی نعمتوں سے نوازے۔

میں اپنے سبھی محترم اساتذہ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، پروفیسر نصیر احمد خان، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر صادق، ڈاکٹر اختر مہدی، ڈاکٹر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر انور پاشا، ڈاکٹر مظہر مہدی اور ڈاکٹر خواجہ اکرام کا ممنون و مشکور ہوں جو ہمیشہ مجھے اپنے مشوروں اور محبتوں سے نوازتے رہتے ہیں۔

اس کتاب کو زیور طباعت سے آراستہ کرانے میں استاد محترم ڈاکٹر شاہد حسین نے قدم قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ ان کے خلوص اور محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں کیوں کہ ان کی محبت مجھے زیادہ عزیز ہے۔ شاعر و ادیب عابد کرہانی نے اس کتاب کی اشاعت میں اہم کردار تو ادا کیا ہی ہے، ساتھ ہی انہوں نے ہر منزل پر اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا ہے اور زندگی کے پُر پیچ راستوں پر چلنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ اس کا بدل محض شکریہ کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔ مجھے ان کے خلوص و محبت پر ناز ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے ان کرم فرماؤں کا شکریہ... ادا نہ کروں جنہوں نے میری تعمیر و ترقی میں ہر ممکن اعانت کی ہے اور میری تعلیمی، تصنیفی، صحافتی اور ادبی سرگرمیوں کو جلا بخشتے رہتے ہیں۔ چناں چہ میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر سجاد رضوی، ڈاکٹر عزیز برنی، کوثر رضوی، ماجد رمن، اسد رضا، قیس رام پوری، نفیس احمد، انبساط احمد علوی، ابرار رحمانی، انیس اعظمی، نسیم احمد، مسعود ہاشمی، رئیس صدیقی، ناصر علی، افتخار الزماں، احتشام حسین (ایڈوکیٹ) تورج زیدی، راغب الدین اور محمد شمیم کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں۔

احمد خان، ریاض الدین، آغا ظفر حسنین، اکبر عابدی، نفیس عابدی، شعیب آذر، آصف پربھات رنجن، روی رنجن، وپن گرگ، دریندر سنگھ، راجن جوہر، ونود، نوشاد، کوثر، ہلال خصوصاً ممتاز اعظمی جیسے نہایت اہم دوستوں کا شکریہ ادا کرنا بھی لازم ہے کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کتاب منصۂ شہود پر نہ آسکتی تھی۔

میں اپنے ادب شناس دوستوں سے امید کرتا ہوں کہ میری اس کوشش میں اگر کوئی خامی راہ پا گئی ہو تو اسے دامن عفو میں جگہ دیں کہ یہی مصنف کے حسن نیت کا صلہ ہوگا۔

حسن مثنیٰ

219۔ ای، برہم پتر ہاسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی

۱۴؍ جولائی ۲۰۰۳ء

☆☆☆

مجتبیٰ حسین: سوانح اور مزاح نگاری

مجتبیٰ حسین ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو چنچولی تحصیل، ضلع گلبرگہ میں پیدا ہوئے جو موجودہ ریاست کرناٹک میں واقع ہے۔ ان کے والد مولوی احمد حسین اور والدہ امیر النساء بیگم تھیں۔ مجتبیٰ حسین ''تکلّف برطرف'' کے ایک تعارفی مضمون ''مجھ سے ملئے'' میں رقم طراز ہیں کہ میرے آباؤ اجداد ایران کے رہنے والے تھے اور درّۂ خیبر کے راستے سے ہندوستان آئے تھے ان کا پیشہ آباء سپہ گری تھا جس پر غالب جیسا شاعر نازاں نظر آتا ہے ''سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری''۔ لیکن مجتبیٰ حسین کو اس بات پر حیرت ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کس لیے لڑتے تھے اور کیوں لڑتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ

> ''میرے والد کہا کرتے تھے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق سپہ گری سے تھا۔ کس لیے لڑتے تھے، مجھے بھی معلوم نہیں۔ میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا مگر ان کے بارے میں اپنے والد اور چچاؤں سے سنا کہ ضلع عثمان آباد میں جو اَب مہاراشٹر میں ہے، ایک معمولی عہدے از قسم کلرک پر مامور تھے۔ چوں کہ مالی حالت اچھی نہیں تھی اس لیے اپنے بچوں کی تعلیم پر مناسب توجہ نہ دے سکے''[1]

موصوف کے مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے دادا محمد حسین صاحب کی زندگی نہایت کسمپرسی میں گزری جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں پر اتنی توجہ نہ دے سکے، جس کے وہ مستحق تھے۔ نتیجتاً مجتبیٰ حسین کے والد مولوی احمد حسین اور تایا مولوی محمد اسحاق نے

مالی بحران سے نجات پانے اور کچھ کر گزرنے کی شدید خواہش کے تحت گھر سے رخت سفر باندھا اور حیدر آباد جا پہنچے۔ دونوں ہی بھائیوں نے نہایت ہی ناگفتہ بہ حالات میں علم حاصل کیا اور اس طرح مولوی محمد اسحٰق ایک معزز وکیل اور مولوی احمد حسین پیشکار بننے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد کو مولوی احمد حسین اپنی شرافت اور ایمان داری کی بدولت تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے دو چھوٹے بھائی محمد غوث اور مظفر حسین بھی پیش کار کے عہدے سے وابستہ تھے۔ بعد میں محمد غوث بھی ترقی پاکر تحصیل دار بن گئے تھے۔ یہ خانوادہ اب بھی اپنے عروج کی جانب گامزن ہے اور آج اس خانوادے کے تقریباً سبھی لوگ اپنی اپنی انفرادیت اور شناخت بنائے ہوئے ہیں جن میں تین ادیب محبوب حسین جگر مرحوم، ابراہیم جلیس مرحوم اور مجتبیٰ حسین سرِ فہرست ہیں۔ شجرۂ نسب آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مجتبیٰ حسین نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد گلبرگہ کے مدرسۂ تحتانیہ آصف گنج میں داخل کرا دیئے گئے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے آصف گنج کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا اور اسی اسکول سے مڈل اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں ان کے والد یہیں تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر ناگزیر ہے کہ مدرسۂ تحتانیہ میں مولوی محمد حسین کی شاگردی اور والد احمد حسین کی صحبت سے موصوف نے کافی مثبت اثرات قبول کئے۔ ان کے استاد مولوی محمد حسین اور ان کے والد مولوی احمد حسین دونوں کو ہی علم و ادب سے گہرا شغف تھا اور اُردو فارسی کے کلاسیکی شعراء کے ہزاروں اشعار انہیں زبانی یاد تھے اور ان کے استاد نے تو غالب کا مکمل دیوان ہی یاد کر رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی ہر بات میں اشعار سے توجیہ پیش کرتے تھے۔ یہی حال ان کے والد کا بھی تھا۔ ان کے گھر کی لائبریری علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید احمد خاں کی کتابوں سے بھری پڑی تھی۔ ان کے والد سرسید اور سرسید تحریک سے کافی متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کا رنگ ڈھنگ انگریزوں سے مماثلت رکھتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین اور ان کے بھائیوں کو ادب سے لگاؤ ورثہ میں حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے ایک تعارفی مضمون ''مجھ سے ملئے'' میں اپنی تاریخِ پیدائش سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''میں ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو پہلی بار پیدا ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک مسلسل زندہ ہوں اور اندیشہ ہے کہ آگے بھی کئی برس تک زندہ رہوں گا''۔[۲]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان کی اصل تاریخِ پیدائش اور تعلیمی اسناد میں درج تاریخِ پیدائش میں پورے تین سال کا فرق ہے کیوں کہ تعلیمی صداقت نامہ میں ان کی تاریخ پیدائش

۱۵ر جولائی ۱۹۳۳ء درج ہے۔ انہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ سب سے بڑے بھائی محبوب حسین جگر سے سترہ سال چھوٹے تھے جن کی تاریخِ پیدائش ۳۰ ر ستمبر ۱۹۱۹ء ہے اور ابراہیم جلیس سے بارہ سال چھوٹے تھے، جن کی تاریخِ پیدائش ۱۹۲۴ء ہے۔ اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ان کی اصل تاریخ پیدائش ۱۹۳۶ء ہی ہے۔ تعلیمی صداقت نامہ میں تاریخِ پیدائش بڑھا کر لکھوانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مجتبیٰ حسین نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور اپنی ذہانت کی وجہ سے مدرسہ تحتانیہ میں چوتھی جماعت میں داخلے کا امتحان پاس کرلیا، جس کی وجہ سے انہیں پہلے دوسرے اور تیسرے درجے میں پڑھنے کا موقع نہ ملا اور اس طرح ان کی عمر تین برس زائد لکھوانی پڑی تا کہ انہیں آسانی سے داخلہ مل سکے۔ ان دنوں سابق ریاست حیدرآباد میں میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے ایک خاص عمر کی پابندی ضروری تھی جسے پورا کرنا لازمی تھا ورنہ مجتبیٰ حسین جیسے ذہین طالب علم کے تین سال ضائع ہو جانے کا خدشہ تھا۔ مجتبیٰ حسین ذہین تو تھے لیکن محنتی کم تھے یعنی انہیں دورانِ تعلیم پڑھائی سے کوئی خاص
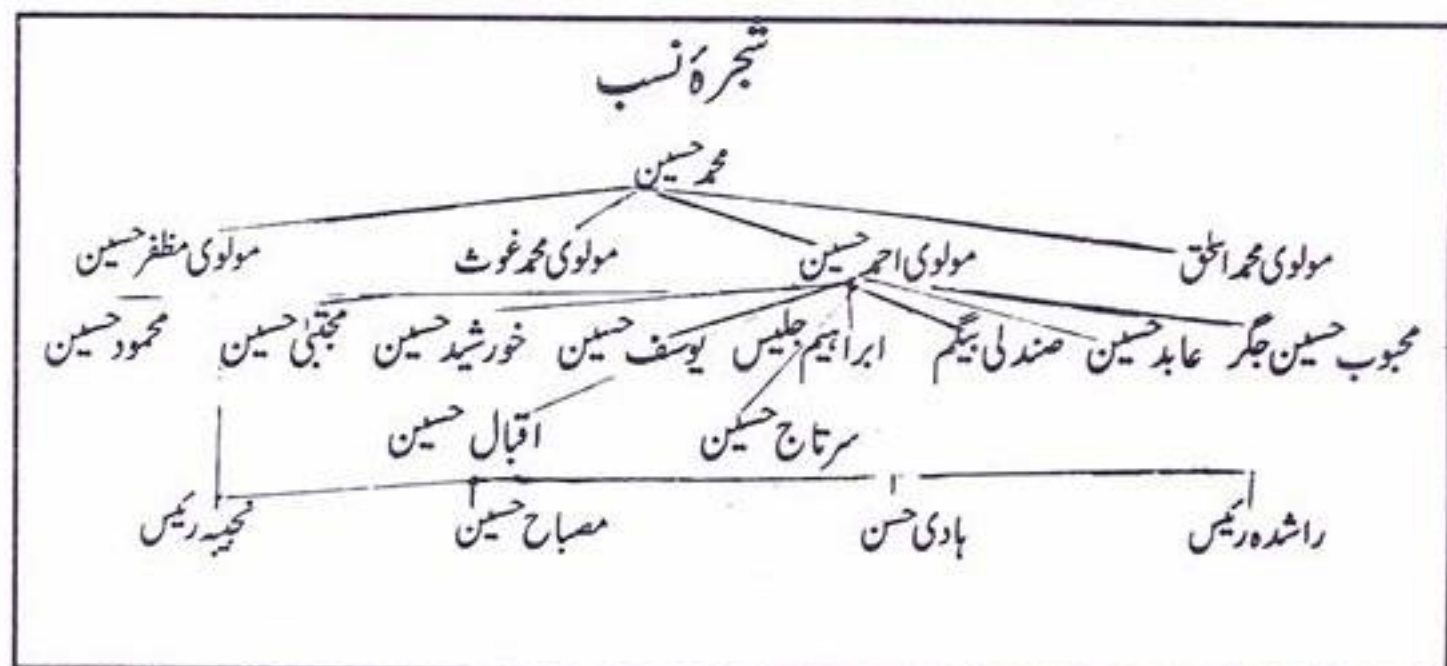
دلچسپی نہ تھی جس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

> ''اپنی تعلیم کے بارے میں یہ عرض کردوں کہ پرائمری اسکول میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا رہا، مڈل اسکول میں فٹ بال کھیلتا رہا اور ہائی اسکول میں پنگ پانگ (Table Tennis) اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں میں نام کماتا رہا۔ البتہ کالج پہنچ کر اسپورٹس سے میری دلچسپی کم ہوگئی کیوں کہ سنیما بینی اور ہوٹنگ نے اسپورٹس کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہ دی۔ غرض زمانۂ طالب علمی میں ہر اُس سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا جو خارج از نصاب ہو۔ مجھے داخل در نصاب سرگرمیوں سے ہمیشہ چڑ رہی''۔ [۳]

گزشتہ صفحہ میں حاصل شدہ معلومات کے ذریعے میں نے ایک شجرہ بنانے کی کوشش کی ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے والد مولوی احمد حسین کو خدا نے دس اولادیں عطا کیں (نو بیٹے اور ایک بیٹی) جن میں محبوب حسین جگر، عابد حسین، ابراہیم جلیس، یوسف حسین اور اقبال حسین پانچ بھائی مجتبیٰ حسین سے بڑے تھے۔ ان کے علاوہ محمود حسین، خورشید حسین اور سرتاج حسین موصوف کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک بہن صندلی بیگم تھیں جو ابراہیم جلیس سے بڑی تھیں۔ ان سبھی میں محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور خود مجتبیٰ حسین نے اُردو ادب میں گراں بہا اضافے کئے۔ یہاں ہم ان کے دو بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کی ادبی خدمات کا مختصر تعارف پیش کریں گے تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مجتبیٰ حسین کی ذہنی تربیت میں ان کا کیا رول تھا۔

آیئے! اُن تین ادیب بھائیوں کی شخصیت پر نظر ڈالنے سے پہلے گلبرگہ کی تاریخی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے چلیں۔ گلبرگہ ایک مردم خیز خطّہ ہے جہاں سلسلہ عالیہ چشتیہ کے کوہِ نور، حضرت خواجہ سید محمد بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کا مزار ہے جنہوں نے ایک سو پانچ برس کی عمر شریف پائی اور ایک سو پانچ ہی نہایت اہم اور معیاری تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ شاید یہ ان ہی کے فیضان کا کرشمہ ہے کہ ان کی بستی گلبرگہ شریف سے محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین ایسا جادوئی قلم لے کر باہر نکلے جس نے علم و ادب کی دُنیا میں نہ صرف دھوم مچا دی بلکہ دُنیائے علم و ادب میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا کہ ایک ہی بستی کے تین بھائی، تینوں ادیب تینوں صحافی، جن کی تحریروں کا قدردان تمام عالمی ادب ہے۔ یہ تینوں بھائی ترقی پسند تحریک سے متاثر رہے ہیں اور محبوب حسین جگر تو ترقی پسند تحریک کے ان حامیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس تحریک کو پروان چڑھانے کے لیے عظیم ترین قربانیاں پیش کی ہیں۔ اس تحریک سے اُن کی وابستگی کا ذکر کرشن چندر نے اپنے رپورتاژ پودے میں کیا ہے جسے انہوں نے حیدرآباد میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس کے انعقاد کے بعد لکھا تھا۔ یہ محبوب حسین جگر کا ہی کمال تھا کہ انہوں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز بہن کی زندگی کا لہو دے کر ادب کو زندہ کر دیا۔ محبوب حسین جگر کے اندر موجود جذبے کا اظہار کرشن چندر نے یوں کیا ہے:

> ''اس کی بہن مرجائے لیکن تہذیب زندہ رہے، تمدُّن زندہ رہے، فن کار کا خیال زندہ رہے، اس کی بہن کو اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دے دے لیکن کتاب زندہ رہے، زبان زندہ رہے، قوم کی روح زندہ رہے''۔[۴]

مجتبیٰ حسین نے بھی ۱۹۶۶ء میں منعقدہ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کی جس کی

روداد ایک پلیٹ تخلص بھوپالی کے عنوان سے لکھی ہے۔ جس کے ذریعے انہوں نے کافی مقبولیت بھی حاصل کی۔ پیش ہے اس رپورتاژ کا ایک اقتباس جس میں مجتبیٰ حسین کا فن نکھر کر سامنے آیا ہے۔

''اس دن تو لوگ جیسے ہنسنے پر تلے بیٹھے تھے۔ میرے اسٹیج پر پہنچتے ہی لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور میں نے حاضرین سے کہا: حاضرین! ہنسنے کے معاملے میں محتاط ہو جایئے۔ اپنی ہنسی ذرا دیکھ بھال کر خرچ کیجئے۔ اگر ایک مزاح نگار آپ کے پیٹ میں سو بَل ڈال دے تو ۲۸ مزاح نگار یقیناً ۲۸۰۰ بَل ڈال سکتے ہیں۔ اگر آپ ہنسنے کے معاملے میں کفایت شعاری کا ثبوت نہ دیں اور آپ کو کچھ ہو جائے تو اس کی ذمہ داری منتظمین کانفرنس پر عائد نہ ہوگی''۔ لوگ میری اس بات پر بھی ہنسنے لگے۔ میں نے کہا: ''آپ ہنستے ہیں تو ضرور ہنسئے' میرا کام آپ کو صرف خطرے سے آگاہ کرانا تھا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی ہنسی-----'' پھر میں نے حاضرین کو یہ خوش خبری سنائی کہ اب سارے مزاح نگاروں کو باری باری اسٹیج پر آنے کی زحمت دی جائے گی تاکہ جو اصحاب اب تک صرف مزاح نگاروں کی تحریریں پڑھ کر ہنستے آئے ہیں' وہ لگے ہاتھوں انہیں دیکھ کر بھی ہنسیں''۔ ۵

یوں تو محبوب حسین جگر نے اپنا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا لیکن جب ۱۹۴۹ء میں جناب عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر صاحب نے مل کر روزنامہ سیاست کا اجراء کیا تو اسی دن سے محبوب حسین جگر روزنامہ سیاست کے جوائنٹ ایڈیٹر ہو گئے اور تادمِ مرگ اسی عہدے پر فائز رہے۔ جگر صاحب کو ایک عظیم صحافی بنانے میں عابد علی خاں کی رفاقت نے بھی بڑا اہم رول ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں صحافیوں کی اس صف میں شامل کیا جاتا ہے جس میں مولانا ظفر علی خاں اور عبدالمجید سالک' مولانا غلام رسول مہر' مولانا محمد عثمان فارقلیط وغیرہ جیسے ممتاز صحافیوں کے نام آتے ہیں۔ اپنے صحافتی کیریر کے دوران انہوں نے سیکڑوں صحافیوں کی ذہنی تربیت کا کام انجام دیا۔ بہ قول مجتبیٰ حسین:

''محبوب حسین جگر صاحب میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ ابراہیم جلیس مرحوم سے پانچ سال اور مجھ سے سترہ سال بڑے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی ذہنی تربیت

میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ابراہیم جلیس تو خیر ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے تھے لیکن میری ذہنی تربیت تو سراسر اُنہیں کی مرہونِ منت تھی۔ آزادی سے پہلے جب میں تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا تو گلبرگہ میں میرے نام سے میرے پتے پر پھول، غنچہ اور بچوں کے کئی رسالے آیا کرتے تھے۔ یہ رسالے جگر صاحب نے میرے نام جاری کروا رکھے تھے۔ اس عمر میں اپنے نام سے کوئی رسالہ آتا تھا تو فطری طور پر مجھے بہت خوشی ہوتی تھی اور میں اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھنا نہ صرف ضروری سمجھتا تھا بلکہ اپنے نام آئے ہوئے ان رسالوں کو کسی اور کو پڑھنے کے لیے بھی نہیں دیتا تھا۔ ادب کو اپنی میراث اور اپنی ذاتی زندگی کا لازمی جز سمجھنے کا پہلا احساس مجھے انہیں رسالوں کے ذریعے ہوا''۔[6]

مجتبیٰ حسین کے دوسرے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ ایک ایسے ادیب ہیں جنہوں نے کم عمری میں ہی برصغیر ہندوپاک کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں اور طنز نگاروں میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ ان کی دو کتابیں چالیس کروڑ بھکاری اور دو ملک ایک کہانی اُردو ادب میں گراں بہا اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ موصوف تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۴ سال تھی۔ اس وقت سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک وہیں کے ہو رہے اور ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ موت سے قبل تک وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار ''مساوات'' کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے اردو صحافت کو ایسا وقار و اعتبار بخشا جس پر اُردو صحافت آج بھی نازاں ہے۔ دونوں ہی بھائی نہایت قلندرانہ زندگی کے رَسیا تھے اور جب تک زندہ رہے، ظاہری نام و نمود، جاہ و حشمت اور مال و متاع سے بے نیاز رہے۔ اُن کی زندگی کا مقصد قوم و سماج کی فلاح و بہبود تھا جس پر دونوں ہی تا دمِ مرگ ثابت قدم رہے۔ انہیں کے نقشِ قدم پر مجتبیٰ حسین اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ادب کے معاملے میں آج بھی وہ پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر اور مشتاق احمد یوسفی کو اپنی کمزوری گردانتے ہیں۔

مندرجہ بالا پس منظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجتبیٰ حسین کا ادب سے لگاؤ فطری تھا۔ تقسیم ملک کے وقت ان کے والد عثمان آباد منتقل ہو گئے لیکن انہوں نے مجتبیٰ حسین کو Students Hostel میں رکھا تا کہ ان کی تعلیم پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ دورانِ

تعلیم زیادہ تر ہاسٹلوں میں ہی مقیم رہنے کی وجہ سے ان میں بُردباری اور دوستی کرنے کا فن پروان چڑھتا رہا جو ان کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے۔ اپنی اس خوبی کا ذکر انہوں نے اپنے مشاغل بیان کرتے ہوئے یوں کیا ہے:

> ''مزاح نگاروں کے اجتماعات منعقد کرانا' دوستوں میں اپنی عمرِ عزیز کا قیمتی وقت ضائع کرنا' خطوط کے جوابات نہ دینا' اپنے سائے سے ڈرنا' دوسروں کی مشکلات کو اپنی مشکلات جاننا اور خود مشکلات میں گھر جانا' علی الصباح گھر کو واپس ہونا اور علی الصباح گھر سے نکل جانا''۔[7]

مجتبیٰ حسین کی اس خوبی میں ان کی مزاح نگاری کو خاصا دخل ہے اور آج بھی وہ جس محفل میں جاتے ہیں' اُسے زعفران زار بنا دیتے ہیں اور جانِ محفل قرار پاتے ہیں۔ اُن کے چاہنے والے ملک و بیرون ملک ہر جگہ پائے جاتے ہیں جس میں ہر طبقے' ہر مذہب اور ہر رنگ و نسل کے افراد شامل ہیں۔

انہوں نے ۱۹۵۱ء میں میٹرک پاس کیا پھر ۱۹۵۳ء میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹر آرٹس کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اس دوران وہ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی بزمِ اُردو کے جنرل سکریٹری بھی رہے جو اُن کی تخلیقی' سماجی' ادبی اور تنظیمی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ اسی سال انہوں نے گلبرگہ میں ایک تاریخی مشاعرہ بھی منعقد کرایا جس میں کیفیؔ اعظمی' مجروحؔ سلطان پوری' جگن ناتھ آزادؔ' سلیمان اریبؔ اور شاہد صدیقی جیسے نامور شعراء نے حصہ لیا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے کالج کی تمام تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور پورے کالج میں ایک گلوکار و اداکار کے طور پر مشہور تھے۔ اُن کی اداکاری کا جوہر خواجہ احمد عباس کا ڈرامہ یہ امرت ہے میں اُس وقت آشکار ہوا جب اُنہیں اِس ڈرامے میں مزدور کا کردار ادا کرنا پڑا' جس میں انہوں نے کمالِ اداکاری کا ثبوت دیا اور اول انعام کے مستحق قرار پائے اور محبوب شاہی ملز کے مالک نے انہیں سو روپے بہ طور انعام دیا۔

۱۹۵۳ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد گریجویشن کی تکمیل کی خاطر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے آرٹس کالج میں داخلہ لیا جس کے بابُ الداخلہ پر آنا مَدینۃُ العِلم وَ عَلیٌ بابُھا کے روشن حروف آج بھی بے شمار طلباء کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے بہت جلد ہی گلبرگہ کی طرح یہاں بھی حلقہ احباب وسیع کرلیا اور بزمِ ادب کے انتخابات میں جنرل

سکریٹری منتخب کر لئے گئے اور اس کالج کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ موصوف زمانہ طالب علمی سے ہی مختلف انجمنوں، روزناموں، ماہناموں سے منسلک رہے اور اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں دہلی آنے کے بعد انہوں نے یہاں بھی طنز و مزاح کے فروغ کی طرف توجہ کی اور ۱۹۷۳ء میں سبھدرا جوشی کے رسالہ Secular Democracy اور ڈاکٹر خلیق انجم کے تعاون سے لال قلعہ میں ایک کل ہند مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کرایا جس کے ذریعہ دکن کے کئی شعراء مثلاً بوگس حیدرآبادی، سلیمان خطیب، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ وغیرہ نہ صرف شمال میں روشناس ہوئے بلکہ انہوں نے بے پناہ مقبولیت بھی حاصل کی۔ اس مشاعرہ میں بھی مجتبیٰ حسین کی تنظیمی صلاحیتوں کے جوہر دیکھنے کو ملے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں کئی بار مختلف انجمنوں کی سکریٹری شپ سنبھالنی پڑی جس کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں:

> ''میں اب تک چھ مرتبہ جنرل سکریٹری بن چکا ہوں۔ گلبرگہ کالج میں پڑھتا تھا تو طلبہ کی ایک انجمن کا جنرل سکریٹری تھا۔ آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی مجھے اسی عہدے سے نوازا گیا۔ ایک ادبی انجمن قائم ہوئی تو اس کا بھی جنرل سکریٹری ہی رہا۔ ۱۹۶۶ء میں مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کا بھی جنرل سکریٹری ہی رہا۔ پھر اگست ۱۹۶۷ء میں جشنِ مزاح منعقد ہوا تو تب بھی جنرل سکریٹری ہی رہا۔ جنوری ۱۹۶۸ء مجھے زندہ دلانِ حیدرآباد کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اپنی موت تک جنرل سکریٹری شپ سے آگے نہ بڑھوں گا''۔ ۸

۱۹۵۶ء میں گریجویشن کی تکمیل کی اور ۱۹۵۸ء میں (Diploma in Public Administration) کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ اسی دوران اُن کے والدین نے ۱۱ر نومبر ۱۹۵۶ء کو ان کی شادی چچازاد بہن ناصرہ بیگم بنت مولوی محمد غوث سے کر دی جو مہاراشٹر گورنمنٹ میں تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے، جن کا انتقال ۲۰۰۱ء میں امریکہ میں ہوا جہاں وہ اپنے بیٹوں کے پاس مقیم تھے۔ انہوں نے ۱۰۲ برس کی عمر پائی۔ آیئے دیکھیں مجتبیٰ حسین اپنی شادی کا بیان کس مزاحیہ انداز میں کرتے ہیں:

> ''ابھی اچھی طرح ہوش سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ والدین نے شادی کر دی

اور یوں میرے رہے سہے ہوش پھر اُڑ گئے اور اب تک اُڑے ہوئے ہیں''۔ ۹

مجتبیٰ حسین کے چچا اور خسرِ محترم خاندان میں پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اپنی عمر کی سویں سالگرہ منائی۔ محترمہ ناصرہ کے 'ناصرہ رئیس' بننے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ مجتبیٰ حسین جب دسویں درجے میں تھے تو انہوں نے مسلم ضیائی کے پرچے 'تارے'، جو حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا، میں بچوں کی کئی کہانیاں مجتبیٰ رئیس کے نام سے لکھی تھیں، اس مناسبت سے ناصرہ بیگم ناصرہ رئیس ہوگئیں۔

مجتبیٰ حسین کے چار اولادیں ہوئیں جن میں سے دو بیٹے ہادی حسین سول انجینئر اور مصباح حسین مکینیکل انجینئر ہیں اور دو بیٹیاں پہلی بیٹی راشدہ صمدانی بی بی رضا ڈگری کالج گلبرگہ میں تاریخ کی لکچرر ہیں۔ ان کے شوہر غلام صمدانی گلبرگہ ہی میں الکٹریکل انجینئر اور دوسری بیٹی نجیبہ رئیس ہیں جن کی شادی لیاقت علی خاں سے ہوئی جو دہلی میں فائنس منسٹری میں ملازم ہیں۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد مجتبیٰ حسین حیدرآباد میں محکمہ مال سے وابستہ ہوگئے لیکن وہ بہت دنوں تک اس ملازمت سے نباہ نہ کر سکے اور چند مہینوں میں ہی اس سے دست بردار ہو کر روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوگئے جو ان کے میلانِ طبع کا پتہ دیتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اس روزنامہ کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ اب ان ہی کی نگرانی اور تربیت میں مجتبیٰ حسین نے صحافت جیسے جاں فشاں پیشے کو اپنایا اور تقریباً سات برسوں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک ایک صحافی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

۳۱ رجولائی ۱۹۶۲ کو روزنامہ سیاست کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سیاست کی انتظامیہ کو ایک ایسے ادیب کی ضرورت آن پڑی جو شاہد صدیقی کا مزاحیہ کالم شیشہ و تیشہ لکھ سکے' کافی غور و خوض کے بعد مجتبیٰ حسین کو یہ کالم لکھنے کے لیے منتخب کیا گیا اور جب ۱۲ راگست ۱۹۶۲ء کی صبح مجتبیٰ حسین دفتر پہنچے تو ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے حکم صادر کیا کہ وہ آج کا مزاحیہ کالم لکھیں۔ اس طرح تعمیل حکم نے موصوف سے پہلا مزاحیہ کالم شیشہ و تیشہ لکھوایا جو ۱۵ راگست ۱۹۶۲ء کو شائع ہوا۔ بقول شاد عارفی:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا

طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسے مزاح نگار ہیں جنہیں اس صنف کی جانب لایا گیا۔ انہوں نے اپنے تعارفی مضمون ''مجھ سے ملئے'' میں اپنی مزاح نگاری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مجھ جیسے سنجیدہ مزاج آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمہ داری میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر 'سیاست' جناب عابد علی خاں پر عائد ہوتی ہے۔ ان ہی بزرگوں اور سرپرستوں کے حکم کی تعمیل میں ۱۲راگست ۱۹۶۲ء کو دن کے ٹھیک ساڑھے دس بجے سے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور یہ نان اسٹاپ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ لوگ پیٹ کے لیے روتے ہیں اور میں پیٹ کے لیے ہنسنے لگا اور اب تک ہنستا چلا جارہا ہوں''۔[۱۰]

انہیں اس بات کا افسوس بھی ہے کہ شروع میں انہیں خاطر خواہ شہرت اس لیے نہیں ملی کہ وہ فرضی ناموں سے مزاح نگاری کرتے تھے۔ انہوں نے ماہنامہ مہونم کے مدیر ناصر کرنولی کی فرمائش پر بھی فرضی نام سے مزاحیہ کالم اور مضامین لکھے اور آج فن کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ پیش ہے ان کے مزاحیہ کالم کا ایک نمونہ جسے انہوں نے ایک فرضی نام کوہ پیما کے نام سے لکھا تھا:

''سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے منہ سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی بات کا اثر سماج کے ایک مخصوص گروہ پر ہی ہوتا ہے۔ پرسوں انہوں نے بھری بزم میں ایک راز کی بات یہ کہہ دی تھی کہ ارکانِ پارلیامنٹ اور اسمبلی کو ماہانہ ۱۵۰۰ روپے ملتے ہیں۔ اس بات کا اثر یہ ہوا کہ ڈاکو چاقو کھول کر ارکانِ پارلیامنٹ اور اسمبلی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ آٹھ دن پہلے کی بات ہے کہ مدھیہ پردیش کے وزیر مسٹر تخت مل جین کو ڈاکوؤں نے چاقو دکھا کر لوٹ لیا۔ ابھی اس صدمہ جانکاہ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ پرسوں کیرالا سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون رکن پارلیامنٹ کو لوٹ لیا گیا۔ اس سارے ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے اتر پردیش کے ایک نائب وزیر نے وضاحتی بیان بھی دیا تھا کہ وزراء کی

حالت بڑی سقیم ہے اور ان میں سے اکثر تو مقروض ہیں۔ مگر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو بھی اس سلسلے میں احتیاط برتنی چاہئے۔ اگر خدانخواستہ وہ رکن پارلیمنٹ منتخب ہوجائیں تو پھر

''الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا''۔[۱۲]

مختصراً یہ کہ روز روز قلم برداشتہ مزاحیہ کالم لکھنے کی مشقت وریاضت نے ان کی تحریروں میں روانی اور برجستگی پیدا کردی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے کالم اتنی مقبولیت حاصل کرگئے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے اخبارات میں بھی نقل کئے جانے لگے۔ اپنے خصوصی کالم کے علاوہ انہوں نے فلمی تبصرے، کتابوں پر تبصرے، سیاسی تجزیے و معلوماتی مضامین وغیرہ بھی لکھے۔ مشہور زمانہ عالم و صاحب طرز ادیب عبدالماجد دریابادی نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اخبار صدقِ جدید میں، اپنے سفرنامہ دکن میں یہ الفاظ لکھے تھے جو آج بھی ان کی فن کاری پر دلالت کرتے ہیں:

''رہنمائے دکن دکن کا ایک معروف و مقبول روزنامہ ہے۔ دوسرا قابلِ ذکر روزنامہ سیاست خاصا سنجیدہ، شریفانہ، معقول و پُر معلومات پرچہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ظریفانہ کالم خوب سنبھالے ہوئے ہے ورنہ لوگ ظرافت اور توہین، دل آزاری یا پھکڑپن کے درمیان فرق ہی نظر انداز کرجاتے ہیں''۔[۱۲]

مجتبیٰ حسین نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون ہم طرف دار ہیں غالبؔ کے، سخن فہم نہیں ۱۹۶۴ء میں اپنے اصلی نام سے اُردو مجلس کے سکریٹری منظور احمد کی فرمائش پر لکھا جو غالبؔ کے یومِ پیدائش کے موقع پر اُردو ہال، حمایت نگر میں سنایا گیا، جس میں پروفیسر ہارون خاں شیروانی، مولوی حبیب الرحمن اور کئی عظیم ہستیاں موجود تھیں اور سبھی نے یک زبان ہوکر مجتبیٰ حسین کو سراہا اور اُن کی ہمت افزائی کی۔ یہ مضمون سب سے پہلے سلیمان اریب کے پرچے صبا میں شائع ہوا۔ موصوف خود رقم طراز ہیں:

''میرا پہلا مزاحیہ مضمون غالبؔ کی طرف داری میں ماہنامہ صبا میں چھپا تھا اور میری عین تمنا ہے کہ میرا آخری مضمون بھی صبا ہی میں چھپے۔ اس کا مطلب یہ کہ صبا میرے آخری مضمون کے انتظار میں مزید ۷۰۔۸۰

برس تک نکلتا رہے۔ آمین ثم آمین''۔[13]

مجتبیٰ حسین کے اس مضمون کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی اور مجتبیٰ حسین نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے صفِ اول کے قلم کاروں میں شمار کیے جانے لگے۔ اس پہلے مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا فن کس قدر روز افزوں ترقی کی جانب گامزن تھا:

''ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ! ضروریاتِ زندگی میں کون کون سی اشیاء شامل ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہا: کھانا' کپڑا' مکان' غالبؔ اور دیوان غالبؔ۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ صاحب غالبؔ کے طرف دار تھے اور اس حد تک طرف دار تھے کہ خود غالبؔ کی ذات سے دیوانِ غالبؔ کو جدا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ان صاحب نے غالبؔ سے اپنی طرف داری جتانے کے لیے ''کلیات میرؔ'' پر بھی ''دیوان غالبؔ'' کا ٹائٹل چڑھا رکھا ہے اور محض ٹائٹل کے دھوکے میں میرؔ کے کلام کو بھی غالبؔ کا کلام سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں قطعِ کلام کرنے کا کوئی موقع عنایت نہیں کرتے کیوں کہ ان صاحب کی نظر میں اُردو شاعری نے صرف ایک ہی شاعر پیدا کیا اور وہ ہے غالبؔ------اُن سے ایک بار پوچھا گیا کہ جناب والا! اُردو کے تین بڑے شعراء کے نام تو بتایئے۔ موصوف نے کہا تھا: ''غالبؔ مرزا غالبؔ اور مرزا اسدُ اللہ خاں غالبؔ''۔ اس پر ہم نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ آگے ان کی دال نہ گلے گی پوچھا کہ اب لگے ہاتھوں چوتھے بڑے شاعر کا نام بھی بتایئے تو کہنے لگے: ''نجم الدولہ' دبیر الملک' مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالبؔ''۔[14]

اس طرح مجتبیٰ حسین نے یکے بعد دیگرے نہایت ہی عمدہ مزاحیہ اور سحر انگیز مضامین لکھنے شروع کیے اور اپنے مضامین سے محفلوں کو زعفران زار بنانے لگے۔ ابھی تک ان کے مضامین کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور قاری سے دادِ تحسین وصول کرنے میں کامیاب

رہے ہیں۔ پیش ہے ان کی تخلیقات و تالیفات کی ایک فہرست:

تکلف بر طرف: نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء
انتساب: اُن سات برسوں کے نام ـــــــ جنہوں نے میری شخصیت اور فن کو نکھارا۔

مشمولات: ا۔ مجھ سے ملئے (۲) تکیہ کلام (۳) میرا سلام کہیو (۴) علامہ نارسا کی وفاتِ مسرت آیات پر (۵) ' مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ (۶) ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں (۷) قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا (۸) غزل سپلائینگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی (۹) لائبریری میں چند گھنٹے (۱۰) سڑک اور شاعر (۱۱) کتنے پابندِ وقت ہیں ہم لوگ (۱۲) ادیبوں کے پریم پتر (۱۳) حیدرآباد بائی نائٹ (۱۴) ایک پلیٹ تخلص بھوپالی (مزاح نگاروں کی کانفرنس کا رپوتاژ)

قطع کلام: نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۹ء
انتساب: اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے نام----

مشمولات: (۱) پس و پیش لفظ (۲) ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے۔ ڈاکٹروں کے (۳) مرزا غالب کی پریس کانفرنس (۴) یہ رکشا والے (۵) دوڑادیئے گھوڑے ہم نے (۶) چاند اور آدمی (۷) سندباد جہازی کا سفرنامہ (۸) ہمارا نوکر (۹) نیا سال پرانا جال (۱۰) ادیبوں کے گھریلو حالاتِ بے تصویر (۱۱) ٹرین میں پڑھنا (۱۲) بہت پچھتائے مہمان بن کر (۱۳) سکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل (۱۴) باورچی (۱۵) عید کی تیاری

خاکے: (۱) اُردو شاعری کے ٹیڈی بوائے حکیم یوسف حسین خاں (۲) ظ۔ انصاری سے ظ۔ انصاری تک

قصہ مختصر: حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۲ء
انتساب: جناب میر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کے نام

مشمولات: (۱) قصہ مختصر (۲) میں اور میرا مزاح (۳) ریل منتری مسافر بن گئے (۴) مرزا کی یاد میں (۵) اس دور میں ہوتے حاتم طائی (۶) گھر کا ٹیلی فون (۷) سردی کی گرماگرمی (۸) مہمان (۹) ہوٹل شبانہ (۱۰) نوکری کی تلاش میں

خاکے: (۱) سلیمان اریب (۲) ایم ایف حسین (۳) سعید بن محمد

بھر حال: حسامی بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۷۴ء
انتساب: ناصرہ رئیس کے نام جس نے اپنے قہقہے بھی مجھے سونپ دیئے ہیں

مشمولات: (۱) قصہ ڈاڑھ کے درد کا (۲) تعزیتی جلسے (۳) چینی ایش ٹرے کی یاد میں (۴) جنابِ صدر (۵) شاعروں کی حکومت (۶) خدا بچائے فلم دیکھنے سے (۷) آٹو رکشا سواری یا سزا! (۸) انتخابی نعرے (۹) ہائے وہ مجرد زندگی

خاکے: (۱) سلام مچھلی شہری---کھویا ہوا آدمی (۲) عزیز قیسی ---پتھر کا آدمی (۳) بھارت چند کھنہ---آخری شریف آدمی (۴) فکر تونسوی---بھیڑ کا آدمی

آدمی نامہ (خاکے): حسامی بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۸۱ء
انتساب: اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس مرحوم کے نام———

مشمولات: (۱) کنہیالال کپور---لمبا آدمی (۲) راجندر سنگھ بیدی ---سو ہے وہ بھی آدمی (۳) اعجاز صدیقی ---اُردو کا آدمی (۴) مخدوم محی الدین---یادوں میں بسا آدمی (۵) کرشن چندر---آدمی ہی آدمی (۶) سجاد ظہیر---- مسکراہٹوں کا آدمی (۷) ابراہیم جلیس---اپنا آدمی (۸) فکر تونسوی---بھیڑ کا آدمی (۹) عمیق حنفی---آدمی در آدمی (۱۰) رضا نقوی واہی---منظوم آدمی (۱۱) خواجہ عبد الغفور ---- لطیفوں کا آدمی (۱۲) حسن الدین احمد--- لفظوں کا آدمی (۱۳) نریندر لوتھر---- شیشے کا آدمی (۱۴) بانی---نو آدمیوں کا آدمی (۱۵) مخمور سعیدی---بہ حیثیت مجموعی آدمی

بالآخر: حسامی بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۸۲ء
انتساب: آمنہ ابوالحسن کے نام----

مشمولات: بالآخر (دیباچہ) ۱۔ اردو کا آخری قاری (۲) برف کی الماری (۳) ڈائریکٹر کا کتا (۴) سورج گہن کی یاد میں (۵) کالونی میں رہنا (۶) لوٹ پیچھے کی طرف (۷) میرے پتے سے لوگوں کو (۸) کیلنڈر جمع کرنے والے (۹) خدا کی قدرت (۱۰) ایک مشاعرے کی رننگ کامنٹری (۱۱) قصہ آرام کرسی کا (۱۲) جشن منانا (۱۳) داد کی بے داد (۱۴) کچھ اُردو

پبلشنگ کے بارے میں (۱۵) بلراج ورما نے تناظر نکالا (۱۶) جانا ہمارا کٹک اور پانا خطاب ہاسیہ رتن کا

جاپان چلو جاپان چلو: (سفرنامہ) حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۳ء
انتساب: ریوجی ایتو ڈائریکٹر جنرل ایشیائی ثقافتی مرکز برائے یونیسکو ٹوکیو کے نام---

مشمولات: (۱) جاپان چلو جاپان چلو (۲) خوش رہو اہلِ وطن (۳) ٹوکیو میں ہمارا ورودِ مسعود (۴) ٹوکیو میں ابنِ انشا کی یاد (۵) پروفیسر سوزوکی اُردو اور مسز سوزوکی (۶) جاپان میں اردو (۷) جاپان میں مزید اُردو (۸) جاپان میں ہم لکھ پتی بن گئے (۹) مہذب پانی اور غیر مہذب پانی (۱۰) یونیسکو کی چھتری (۱۱) بُلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو (۱۲) خموشی گفتگو ہے (۱۳) جاپان میں اسلام (۱۴) ٹوکیو کے بازاروں میں (۱۵) حرفِ آخر

الغرض: حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۷ء
انتساب: سشما کے نام----

مشمولات: (۱) میں نہیں آؤں گا (۲) اور ہم پچاس برس کے ہوگئے (۳) ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ (۴) اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں (۵) ابھینیتا نیتا بن گئے (۶) چہل قدمی اور ہم (۷) حیدرآباد کا جو ذکر کیا (۸) کچھ پھلوں کے بارے میں (۹) مرزا دعوت علی بیگ (۱۰) خوشامد کا فن (۱۱) قصہ ایک نائب وزیراعظم کے شاعر بن جانے کا (۱۲) اولادیں (۱۳) میرا پہلا ہوائی سفر (۱۴) ہم، بیگم اور شاپنگ (۱۵) خوش فہمی (۱۶) ٹیلی ویژن (۱۷) لوٹے ہی لوٹے

سو ہے وہ بھی آدمی (خاکے): حسامی بک ڈپو ۱۹۸۷ء
انتساب: والدِ محترم مولوی احمد حسین مرحوم کے نام---

مشمولات: (۱) فیض احمد فیض (۲) صادقین (۳) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (۴) مشتاق احمد یوسفی (۵) خشونت سنگھ (۶) مشفق خواجہ (۷) پروفیسر آل احمد سرور (۸) پروفیسر خورشید الاسلام (۹) سلیمان

خطیب (۱۰) ساحر ہوشیار پوری (۱۱) شاذ تمکنت (۱۲) نقی تنویر (۱۳) اسد اللہ (۱۴) کنہیا لال کپور

چہرہ در چہرہ (خاکے): مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۹۴ء
انتساب: اردو کی جاپانی اسکالر شاشور کے نام---

مشمولات: (۱) اندر کمار گجرال (۲) خواجہ احمد عباس (۳) اختر حسن (۴) خواجہ حمید الدین شاہد (۵) ظ۔ انصاری (۶) جوگندر پال (۷) احمد سعید ملیح آبادی (۸) ظفر پیامی (۹) کشمیری لال ذاکر (۱۰) شہریار (۱۱) محمد علوی (۱۲) شریف الحسن نقوی (۱۳) کمار پاشی (۱۴) زبیر رضوی (۱۵) امیر قزلباش (۱۶) وقار لطیف (۱۷) ذہین نقوی (۱۷) جسٹس جسپال سنگھ (۱۸) کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی (۱۹) اپنی یاد میں

سفر لخت لخت (سفر نامہ): حسامی بک ڈپو، حیدرآباد ۱۹۹۵ء
انتساب: یارِ دلدار شر ددت کے نام---

مشمولات: (۱) او دیس سے جانے والے بتا (۲) سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی جہاز میں (۳) لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں (۴) قیام الدین کے گھر ہمارا قیام (۵) برطانیہ میں دھوم ہماری زباں کی ہے (۶) کچھ ذکرِ خیر وشر ساقی فاروقی کا (۷) کچھ حال مشتاق احمد یوسفی سے ملاقات کا (۸) کچھ نقی تنویر کے بارے میں (۹) پیرس میں مسرور خورشید نے مسرور کیا (۱۰) حیدرآباد کا جو ذکر کیا (۱۱) ایروفلوٹ میں ہمارا پہلا سفر (۱۲) ہم تاشقند سے بول رہے ہیں (۱۳) ہم نے اردو میں اُزبیک کھانا کھایا (۱۴) اُزبیکستان کے ادیبوں کے درمیان (۱۵) دُنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ (۱۶) جدہ میں جشنِ طنز و مزاح۔ ایک خطبۂ صدارت (۱۷) رامپورہ میں دو دن

آخر کار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۹۷ء
انتساب: ہمدردیرینہ نقی تنویر کے نام---

مشمولات: (۱) دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات (۲) سوئز بینک میں کھاتا ہمارا (۳) صاحب باتھ روم میں ہیں (۴) چار مینار اور چار سو برس (۵) سلطان قلی قطب شاہ کا سفر نامہ (۶) لو آگئی برسات (۷) چوتھا کندھا (۸) شاپنگ یا نادر شاہ کا حملہ (۹) تجھے اے جنوری ہم دور

سے پہچان لیتے ہیں (۱۰) سوری رانگ نمبر (۱۱) ایک خط اٹلانٹا سے (۱۲) افطار پارٹیوں کا دور دورہ (۱۳) اعتراف خدمات کرنے والوں کی خدمات کا اعتراف (۱۴) زندہ دلانِ شکاگو کے نام (۱۵) جشن سے کس کو رستگاری ہے (۱۶) مشاعروں کے شاعر (۱۷) اُردو مشاعرے اور بیرونی سیاح (۱۸) مشاعرے اور مجرے کا فرق (۱۹) معذرت نامہ (۲۰) مشجرہ (۲۱) خوش فہمیاں

میرا کالم: حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۹۳ء
انتساب: عزیز از جاں عزیز آرٹسٹ کے نام---

مشمولات: تماشائے اہل کرم: (۱) اب آم عام نہیں رہے (۲) کتو! انسانوں سے خبر دار رہو (۳) ملکہ ایلزبتھ اور ہمارا باورچی خانہ (۴) پکوان میں کتابت کی غلطی (۵) قصہ ایک ہم شکل کا (۶) ذکر پھر ملنے بلّی کا (۷) ہمارے گھر پر چھاپہ (۸) ملک کی پہلی مسلم گریجویٹ خاتون (۹) ایک مختلف دن (۱۰) مزاج پرسی کرنا ایک مشکل فن ہے (۱۱) تھوکنا منع ہے (۱۲) حیدرآبادی کھانوں کا میلہ (۱۳) چلو اکیسویں صدی میں (۱۴) ابراہم لنکن نرالا بن گئے (۱۵) مدرٹریسا کے ساتھ کچھ ساعتیں (۱۶) محکمہ موسمیات کی حمایت میں (۱۸) کچھ حیدرآبادیوں کے بارے میں (۱۹) گلبرگہ میں چار دن (۲۰) نئے سال کی پیشگی مبارکباد ملنے پر

تماشائے اہل ستم: (۱) کمسن مجاہدین آزادی (۲) ہنسنا چھوڑو اور قوم کی خدمت کرو (۳) اس سادگی پہ کون نہ مرجائے (۴) اشیاء اور انسانوں کے دام (۵) بل کلنٹن کو نیند کیوں نہیں آتی ہے (۶) کابینہ بنانا (۷) دیش کدھر جارہا ہے (۸) ایجنڈے میں کیا ہے (۹) نقشِ قدم پر کیوں چلیں (۱۰) ایک چیف منسٹر کی سبق آموز زندگی (۱۱) منسٹر کے بیٹے نے رشوت دی (۱۲) پچاس برس۔ ملک کے اور اپنے (۱۳) کچھ معافی مانگنے کے بارے میں (۱۴) ذکر پھر سیاست دانوں کا

تماشائے اہل قلم: (۱) سردار جعفری، اردو ادب اور گیان پیٹھ انعام (۲) پروین شاکر کی یاد میں (۳) یوسف ناظم کے تخلیقی سفر کی نصف صدی (۴) اُردو پہ مرنا اردو میں مرنا (۵) کہانی کب ختم ہونی چاہئے (۶) اردو یونیورسٹی اور سہرہ بندی (۷) اُردو جیل میں پہنچ گئی (۸) اردو کی نئی بستیاں (۹) اردو اساتذہ اور اردو کا مستقبل (۱۰) بجلی، بجلی بورڈ اور اردو ادب (۱۱) بجٹ اور اردو شاعری (۱۲) اردو شاعری اور آٹو رکشا (۱۳) انتظار حسین اور جیلانی بانو کو مبارک

باد (۱۴) کچھ امجد اسلام امجد کے بارے میں (۱۵) قدیر زماں کا رشوت نامہ (۱۵) عینی آپا سے ایک ملاقات (۱۷) حیدرآباد، سیاست اور مشفق خواجہ (۱۸) نجم الحسن رضوی تم کہاں ہو؟ (۱۹) نامی انصاری اور اردو طنز و مزاح نگاری (۲۰) کشور ناہید نے حیدرآباد میں کیا دیکھا (۲۱) رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے (۲۲) ایک کتاب کی رسم اجرا پر (۲۳) ذکر پروفیسر بشیر الدین احمد کا۔

ہوئے ہم دوست جس کے: تخلیق کار پبلیشرز، نئی دہلی ۱۹۹۹ء
انتساب: شیطانِ ظریف حمایت اللہ کے نام جس کا دامن ظرافت اور شرافت کی نیکیوں سے مالا مال ہے۔

مشمولات: (۱) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (۲) شمس الرحمان فاروقی (۳) پروفیسر نثار احمد فاروقی (۴) وحید اختر (۵) پروفیسر شکیل الرحمن (۶) پروفیسر قمر رئیس (۷) قتیل شفائی (۸) پروفیسر رشید الدین خاں (۹) ابراہیم شفیق (۱۰) عوض سعید (۱۱) ف۔س۔ اعجاز (۱۲) سیدہ شانِ معراج (۱۳) استاد محمود مرزا (۱۴) رشید قریشی (۱۵) دیوکی نندن پانڈے (۱۶) علی باقر (۱۷) وہاب عندلیب

قطع کلام: (مزاحیہ مضامین کا انتخاب، مرتبہ: رعنا فاروقی، مکتبہ ہم زبان کراچی ۱۹۸۹ء

مشمولات: (۱) میں نہیں آؤں گا (اکیسویں صدی کے نام) (۲) ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ (۳) ڈائریکٹر کا کُتا (۴) اُردو کا آخری قاری (۵) لوٹ پیچھے کی طرف (۶) تعزیتی جلسے (۷) اس دَور میں ہوتے حاتم طائی (۸) مرزا کی یاد میں (۹) مرزا غالب کی پریس کانفرنس (۱۰) چاند اور آدمی (۱۱) تکیہ کلام (۱۲) قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا (۱۳) راجندر سنگھ بیدی (۱۴) کنہیا لال کپور (۱۵) صادقین (۱۶) مشفق خواجہ (۱۷) دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ (۱۸) ٹوکیو میں ابن انشا کی یاد

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (جلد اول) مرتبہ: حسن چشتی

(۱) ریل منتری بن گئے (۲) ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ (۳) مرزا کی یاد میں (۴) حیدرآباد کا جوکر کیا (۵) یونیسکو کی چھتری (۶) میں نہیں آؤں گا (۷) ڈائریکٹر کا کتا (۸) قصہ داڑھ کے درد کا (۹) صاحب باتھ روم میں ہیں (۱۰) اردو کا آخری قاری (۱۱) چار مینار اور چار سو برس (۱۲) سند باد جہازی کا سفر نامہ (۱۳) دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ (۱۴) اردو مشاعرے اور بیرونی سیاح (۱۵) مشاعرے اور مجرے کا فرق (۱۶) معذرت نامہ (۱۷) چینی ایش ٹرے کی یاد میں (۱۸) برف کی الماری (۱۹) تکیہ کلام (۲۰) دیمکوں کی ملکہ سے

ملاقات (۲۱) قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا (۲۲) مرزا غالب کی پریس کانفرنس) (۲۳) سوئز بینک میں کھاتہ ہمارا (۲۴) ایھینا نیتا بن گئے (۲۵) لوٹ پیچھے کی طرف (۲۶) میرے پتے سے لوگوں کو (۲۷) آم اب عام نہیں رہے (۲۸) قصہ ایک ہم شکل کا (۲۹) ہمارے گھر پر چھاپہ (۳۰) چوتھا کندھا (۳۱) تعزیتی جلسے (۳۲) ٹوکیو یاد ابن انشا کی (۳۳) جناب صدر (۳۴) تجھے اے جنوری ہم دور سے پہچان لیتے ہیں (۳۵) اس دور میں ہوتے حاتم طائی (۳۶) مرزا دعوت علی بیگ (۳۷) یہ رکشا والے (۳۸) ٹرین میں پڑھنا (۳۹) سردی کی گرما گرمی (۴۰) چہل قدمی اور ہم (۴۱) کتو! انسانوں سے خبردار رہو (۴۲) شاپنگ یا نادر شاہ کا حملہ (۴۳) ایک مختلف دن (۴۴) سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل (۴۵) لو آگئی برسات (۴۶) علامہ نارسا کی وفاتِ مسرت آیات پر۔

مجتبیٰ حسین کے سفرنامے   مرتبہ: حسن چشتی

مشمولات:

جاپان ---------- ۱۹۸۰

☆ جاپان چلو جاپان ☆ خوش رہو اہل وطن ☆ ٹوکیو میں ہمارا وروِدِ مسعود ☆ ٹوکیو میں یاد ابن انشا کی ☆ پروفیسر سوزوکی، اردو اور مسز سوزوکی ☆ جاپان میں اردو ☆ جاپان میں مزید اردو ☆ جاپان میں ہم لکھ پتی بن گئے ☆ مہذب پانی اور غیر مہذب پانی ☆ یونیسکو کی چھتری ☆ بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو ☆ خموشی گفتگو ہے ☆ جاپان میں اسلام ☆ ٹوکیو کے بازاروں میں ☆ حرف آخر

یوروپ ---------- ۱۹۸۴ء

☆ اودیس سے جانے والے بتا ☆ سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی جہاز میں ☆ لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں ☆ قیام الدین کے گھر ہمارا قیام ☆ برطانیہ میں دھوم ہماری زباں کی ہے ☆ کچھ ذکر خیر وشر ساقی فاروقی کا ☆ کچھ نقی تنویر کے بارے میں ☆ پیرس میں مسرور خورشید نے ہمیں مسرور کیا۔

سابق سوویت یونین ------- ۱۹۸۶

ایروفلوٹ میں ہمارا پہلا سفر ☆ ہم تاشقند سے بول رہے ہیں ☆ ہم نے اردو میں ازبیک کھانا کھایا ☆ ازبکستان کے ادیبوں کے درمیان ☆ دنیا کے غفور وا یک ہو جاؤ ☆

مسقط (عمان) ------ ۱۹۹۵ء

☆ پھر وہی مسقط کے رات دن ☆ مسقط کی صفائی اور قصہ اردو شاعری کا ☆ بابائے مسقط، گلبرگہ کے رہنے والے ☆ کچھ حیدرآبادیوں کے بارے میں ☆

سعودی عرب ------ ۱۹۹۶

☆ لبیک اللھم لبیک ☆ اور ہم حاجی بن گئے ☆ ہم مدینہ سے بول رہے ہیں ☆ مدینہ میں انتخابی نتائج کو جاننے کی بے چینی

دوبئی -------- ۱۹۹۷ء

☆ دوبئی سے واپسی ☆ جشن سے کس رستگاری ہے ☆ کچھ باتیں دوبئی کی ☆ نجم الحسن رضوی! تم کہاں ہو؟ ☆ کچھ امجد اسلام امجد کے بارے میں

امریکہ ------- ۲۰۰۰ء

☆ ہم نے ایک ہی دن میں چار مرتبہ بریک فاسٹ کیا ☆ ذکر امریکیوں کی خوش اخلاقی کا ☆ ہم۔ :

واشنگٹن میں مخدوم کو یاد کیا ☆ رچمنڈ کی پہلی ادبی محفل ☆ قصہ ہمارے امریکہ آنے ☆ امریکی بزرگوں کے درمیان ☆ ذکر امریکہ کے اردو اخبارات کا ☆ مشتاق احمد یوسفی سے تجدید ملاقات ☆ ہمارے چاہنے والے ☆ گڈ مارننگ حسن چشتی اور ان کے شکاگو کا ☆ لالی چودھری کا لاس انجلس ☆ فیملی دھوبی سے فیملی مزاح نگار تک ☆ امریکی کانگریس کی عمارت میں نماز جمعہ ☆ ڈاکٹر عابد اللہ غازی اور اقراء فاؤنڈیشن ☆ امریکہ کے ماضی میں ہمارے ماضی کی ملاوٹ ☆ کچھ یادیں امریکہ کی ☆

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (خاکے) جلد دوم — مرتبہ: حسن چشتی

مشمولات: (۱) مخدوم محی الدین (۲) سجاد ظہیر (۳) فیض احمد فیض (۴) راجندر سنگھ بیدی (۵) کنہیا لال کپور (۶) خواجہ احمد عباس (۷) صادقین (۸) اعجاز صدیقی (۹) ابراہیم جلیس (۱۰) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (۱۱) فکر تونسوی (۱۲) سلیمان اریب (۱۳) خواجہ حمید الدین شاہد (۱۴) ظ۔ انصاری (۱۵) عمیق حنفی (۱۶) شاذ تمکنت (۱۷) عزیز قیسی (۱۸) وحید اختر (۱۹) کمار پاشی (۲۰) حکیم یوسف حسین خاں (۲۱) ذہین نقوی (۲۲) اندر کمار گجرال (۲۳) ایم ایف حسین (۲۴) آل احمد سرور (۲۵) خشونت سنگھ (۲۶) مشتاق احمد یوسفی (۲۷) شمس الرحمٰن فاروقی (۲۸) نثار احمد فاروقی (۲۹) رضا نقوی واہی (۳۰) مشفق خواجہ (۳۱) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (۳۲) علی محمد خسرو (۳۳) جوگندر پال (۳۴) مظہر امام (۳۵) مغنی تبسم (۳۶) شہریار (۳۷) کنہیا لال نندن (۳۸) بلراج ورما (۳۹) امیر قزلباش (۴۰) نارنگ ساقی (۴۱) اپنی یاد میں۔

ہندی میں شائع ہونے والے مجموعے

۱۔ قصہ آرام کرسی کا: پستکائن، نئی دہلی ۱۹۸۷ء

۲۔ جاپان چلو جاپان چلو: پستکائن، نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۳۔ سوئز بینک میں کھاتہ ہمارا: پستکائن، نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۴۔ سند باد کا سفر نامہ: راج کمل پرکاشن نئی دہلی ۱۹۹۴ء

۵۔ چہرہ در چہرہ: سارانش پبلشرز نئی دہلی ۱۹۹۹ء

۶۔ مجتبیٰ حسین رچناولی: (زیر طبع) سارانش پبلشرز نئی دہلی۔

تالیفات

۱۔ شیشہ و تیشہ (شاہد صدیقی کے کالموں کا انتخاب) آندھرا پردیش، ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۴ء

۳۔ ماہنامہ آج کل طنز و مزاح نمبر (اپریل، مئی ۱۹۷۴ء) مہمان مدیر کی حیثیت سے مرتب کیا۔

۲۔ ضبط شدہ نظمیں: بہ تعاون ڈاکٹر خلیق انجم ۱۹۷۵ء

اس کے علاوہ ان کے مضامین مختلف ریاستوں کی نصابی کتابوں میں شامل رہے ہیں، مثلاً بہار ایجوکیشن بورڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، مہاراشٹر ٹیکسٹ بک بورڈ وغیرہ۔ وہ

''شگوفہ'' حیدرآباد کی مجلس مشاورت کے رُکن ہیں۔ علاوہ ازیں وہ قومی کونسل برائے فروغ زبان اُردو کے گورننگ باڈی ممبر اور اقبال سمان' مدھیہ پردیش کے جیوری ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

مجتبیٰ حسین اپنے سبھی مجموعوں کے تمام مزاحیہ مضامین میں ایک افسانہ نگار بلکہ ایک قصہ گو کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں جہاں ان کا موضوع انسان اور انسانیت ہے۔ انہیں مرقع نگاری' منظر کشی' واقعہ نگاری' فقرہ بازی اور لطیفہ سازی میں مہارت حاصل ہے۔ ان کا مشاہدہ کافی عمیق ہے جس کی وجہ سے وہ کسی بھی واقعے کے مضحک پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو بھی اپنے موضوع کے موافق استعمال کر لینے کا فن جانتے ہیں۔ ان کا طنز دیرپا اور کامیاب صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں مزاح کی چاشنی ہوتی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ طنز کے تیر مزاح کی کمان سے چلاتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ بسیار نویسی اور زود نویسی کے باوجود طنز و مزاح کا اتنا اعلیٰ معیار برقرار رکھنا مجتبیٰ حسین کا ہی حصہ ہے جس میں ان کے قلم اور ذہن کی معجز نمائی کو پورا پورا دخل ہے۔ یہ ہنر اگر ہمیں سیکھنا اور لطف اندوز ہونا ہے تو بغیر کسی پس و پیش کے مجتبیٰ حسین کی طرف مراجعت کرنی ہوگی کیوں کہ وہ اس فن میں ماہر ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون ''میں اور میرا مزاح'' میں لکھا ہے:

> ''میرے نزدیک مزاح انسان کے پیمانہ وجود کے لبریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے۔ جب انسان کے وجود کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو قہقہوں کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے۔ اسی لیے کھوکھلے آدمی اوّل تو قہقہے نہیں لگاتے اور اگر لگاتے بھی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے یہ قہقہے کسی اندھے کنویں کی گہرائیوں سے ابھر رہے ہیں''۔ [15]

وہ مزاح کو ایک ایسی کیفیت گردانتے ہیں جس کی حدیں سچے غم کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ انہوں نے لکھا بھی ہے کہ:

> ''بعض لوگ مزاح کی کیفیت کو بہت معمولی سمجھتے ہیں حالاں کہ سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں غم کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہے کی طرف جست لگاتا ہے' وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔

ہنسنے کے لیے جس قدر گہرے شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے، اتنے گہرے شعور کی ضرورت شاید رونے کے لیے درکار نہیں ہوتی''۔ ۱۶

مجتبیٰ حسین کے کالم، مضامین، خاکے اور سفرنامے بھی ان کے وضع کردہ پیمانے پر کھرے اُترتے ہیں۔ وہ اپنے مضامین میں ایسی بے تکلفانہ فضا پیدا کردیتے ہیں کہ قاری مضمون کے اختتام تک ڈوبا ڈوبا سا رہتا ہے۔ اس میں ان کا بنیادی اور اہم وصف نرالا اندازِ بیان ہے جو ہمیں ہنسنے اور قہقہہ لگانے پر مجبور کرتا ہے لیکن اس کے فوراً بعد سوچنے کا عمل شروع ہوتا ہے جو بہت دیرپا ہوتا ہے۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

''میرے مضمون کے پیچھے کوئی نہ کوئی جیتا جاگتا کردار ہوتا ہے جس کی نشاندہی میں اس لیے نہیں کرتا کہ مجھے اپنی سلامتی عزیز ہے اور دوسری طرف جن کرداروں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا روئے سخن ان کی طرف ہے تو وہ بھی میرے سامنے اس کی نشان دہی نہیں کرتے کیوں کہ انہیں بھی اپنی سلامتی عزیز ہوتی ہے۔ گویا مزاح کا معاملہ ایک خوش گوار معاہدہ ہے''۔ ۱۷

مجتبیٰ حسین ہندوستان کے ان چند مزاح نگاروں میں سے ایک ہیں جنہیں ابتدا سے ہی ادبی تہذیبی اور تنظیمی سرگرمیوں میں خاصی دلچسپی رہی ہے۔ خواہ وہ بزم اُردو گلبرگہ کے تحت مشاعرہ ہو کہ بزمِ ادب عثمانیہ یونیورسٹی کے انتخاب یا پھر دوسری سرگرمیاں۔ ان کا ذہن ہمیشہ ہی کچھ کر گزرنے کی طرف راغب رہا ہے۔ اسی جودتِ طبع نے ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا کہ کیوں نہ ہندوستان کے تمام اُردو مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۹۶۶ء میں اپنے قریبی دوست حفیظ قیصر کی مدد سے مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا جو زندہ دلان حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی۔ مجتبیٰ حسین اس تنظیم کے جنرل سکریٹری اور بھارت چندر کھنہ صدر بنے چناں چہ ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ر مئی ۱۹۶۶ء کو حیدرآباد میں اُردو کے مزاح نگاروں کی ایک ایسی تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی مثال برصغیر ہندو پاک میں اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کانفرنس کا افتتاح مخدوم محی الدین نے کیا اور صدارت کے فرائض کرشن چندر نے انجام دیئے۔ اس کانفرنس میں مجتبیٰ حسین نہ صرف ایک کامیاب منتظم ثابت ہوئے بلکہ وہ ایک کامیاب مزاح نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہو گئے۔ اس کانفرنس میں ان کا ہر مضمون تالیوں کی گونج اور قہقہہ بہ

دوش آوازوں کے بیچ سُنا گیا۔ انہوں نے اس کانفرنس کا ایک دلچسپ رپورتاژ ایک پلیٹ تخلص بھوپالی کے عنوان سے لکھا جس نے ان کے فن کو تشخص بخشا اور انہیں مستند و معتبر بنا دیا۔ مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر میں زندہ دلان حیدرآباد اور اس کے تحت منعقد کی گئی یہ کانفرنس ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ان کے فن کو شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر متاثر کیا۔ موصوف نے اس کانفرنس کے ذریعے مزاح نگاری کو ایک تحریک کی شکل دے دی، جس کے زیرِ اثر ہندوستان کے کئی شہروں میں اس طرح کے اجتماعات منعقد ہونے لگے، مثلاً ۱۹۶۸ء ممبئی میں سُر سنگار سمسد نے طنز و مزاح کا ایک پروگرام قہقہہ کے عنوان سے آراستہ کیا جس میں مجتبیٰ حسین بھی شامل ہوئے۔ ہندی ادیب وصحافی کنہیالال نندن اور ہندی رسالہ دھرم یگ کے ایڈیٹر دھرم ویر بھارتی وغیرہ نے انہیں خراج تحسین پیش کیا اور ان کی تخلیقات کو اپنے رسالہ دھرم یگ میں کئی سال تک شائع کرتے رہے۔ اس طرح مجتبیٰ حسین کی تخلیقات پہلی بار ہندی میں منتقل ہوئیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ان کی تخلیقات مختلف زبانوں میں منتقل ہو رہی ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ان کے سفر نامہ' جاپان چلو جاپان چلو' کا جاپانی ترجمہ ایک جاپانی اسکالر مسز شا شورے نے کیا اور اس طرح موصوف کی تخلیق کو ایک بیرونی زبان (Foreign Language) میں منتقل ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔

مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک حکومتِ آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات وتعلقات سے بھی وابستہ رہے اور حکومتِ ہند نے جب اُردو کے مسائل کا جائزہ لینے کی غرض سیگجرال کمیٹیتشکیل دی تو انہیں اس کے شعبہ ریسرچ میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس طرح دکن سے دہلی کی جانب پہلی بار کسی مزاح نگار نے مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کی خاطر ہجرت کی۔ گو کہ اس کے پہلے ولی دکنی نے بھی ہجرت کی تھی اور شمالی ہند میں اپنی شاعری کا سکہ رائج کیا تھا جس کے بعد دہلوی شعراء جو کہ دکنی اُردو شاعری کو درخور اعتنا نہ گردانتے تھے' اُردو میں شاعری کرنے لگے۔ اس کے بعد نہ جانے اس زبان میں کتنے عظیم شعراء پیدا ہوئے۔ اسی طرح مجتبیٰ حسین نے بھی دکن سے آکر اپنی مزاح نگاری سے عوام کے دلوں کو تسخیر کرلیا۔ ۱۹۸۳ء میں ان کی تصنیف جاپان چلو جاپان چلو کی رسم اجراء ہوئی جس میں ماہرِ لسانیات' محقق و نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی تقریر میں مجتبیٰ حسین کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''ڈھائی سو سال پہلے ارض دکن سے غزل کا شہزادہ وؔلی دکنی دہلی آیا تھا اور اب ڈھائی سو سال بعد ارضِ دکن سے مزاح کا شہزادہ دہلی آیا ہے اور اس کے آتے ہی دہلی کی مزاحیہ ادبی محفلوں میں ایک جان سی پیدا ہو گئی ہے''۔[18]

دہلی میں قیام کے دوران موصوف ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۴ء میں این۔سی۔ای۔آر۔ٹی سے وابستہ ہو گئے اور کونسل کے پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبہ میں ایڈیٹر کے فرائض انجام دینے لگے۔ انہوں نے اکتوبر ۱۹۸۰ء میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت واشاعت کے موضوع پر ایک سیمینار کے ورک شاپ میں ہندوستان کی نمائندگی کی خاطر تقریباً ۳۵ دنوں تک جاپان کا دورہ کیا جہاں ٹوکیو یونیورسٹی میں ان کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب بھی منعقد کی گئی۔ ان کے اس سفر کی روداد ''جاپان چلو جاپان چلو'' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔۱۹۹۱ء میں N.C.E.R.T. سے سبکدوش ہونے کے بعد اب وہ پھر سے 'سیاست حیدرآباد' میں مزاحیہ کالم نگار کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اس طرح وہ اپنے ادبی کیریئر کو ایک ایسے دائرے کی شکل دینے میں کامیاب ہیں جس کا مرکز فنِ مزاح نگاری ہے۔ اکثر و بیشتر مزاحیہ سیمناروں میں شرکت کی غرض سے مختلف ممالک کا دورہ کرتے رہتے ہیں جہاں ان کے اعزاز میں کئی تقریبیں منعقد کی جا چکی ہیں۔ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے وہ ملک و بیرون ملک کافی مشہور و مقبول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت و مقبولیت کی بنیاد پر وہ مختلف ملکی وغیر ملکی اسفار کرتے رہتے ہیں۔ پیش ہے بیرون ممالک کے اسفار کی ایک تفصیل:

☆ ۱۹۸۰ء ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت واشاعت کے موقع پر منعقدہ سیمینار اور ورک شاپ میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

☆ ۱۹۸۴ء میں ''اُردو مجلس'' برطانیہ کی دعوت پر انگلستان گئے۔

☆ ۱۹۸۴ء دورۂ پیرس

☆ ۱۹۸۴ء یوروپ میں ایک ماہ قیام کے بعد دورۂ امریکہ جہاں ان کے اعزاز میں نیویارک، واشنگٹن، شکاگو اور ڈیٹرائٹ میں کئی ادبی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ اس کے بعد کنیڈا میں ٹورنٹو و دیگر شہروں کا دورہ کیا۔

☆ ستمبر ۱۹۸۶ء روس۔ ہند دوستی کی انجمن کی دعوت پر اردو ادیبوں کے دورُکنی وفد میں ایک رُکن کی حیثیت سوویت یونین کا دورہ کیا۔ اس دورے میں وہ تاشقند، سمرقند، بخارا، لینن گراڈ اور ماسکو گئے اور وہاں کے ادیبوں اور اسکالروں سے ملاقات کی۔

☆ ۱۹۸۸ء پہلی پاک۔ ہند طنز و مزاح کانفرنس میں بہ حیثیت مہمان خصوصی مدعو کئے گئے جہاں انہوں نے کراچی، لاہور اور راولپنڈی کی متعدد انجمنوں کے جلسوں میں اظہار خیال کیا اور مضامین سنائے۔

☆ ۱۹۸۹ء بزم اُردو جدہ سعودی عربیہ کی جانب سے منعقدہ ہند۔ پاک مزاحیہ سمینار میں بہ حیثیت صدر شرکت کی۔

☆ ۱۹۹۵ء سلطنتِ عمان کے تھرسڈے کلب *(Thursday Club)* عمان کی طرف سے منعقدہ محفلِ طنز و مزاح میں شریک ہونے عمان گئے۔ اس میں ہند و پاک کے مختلف مزاح نگاروں نے بھی شرکت کی تھی۔

☆ اپریل ۱۹۹۶ء ہندوستانی عازمین حج کے سرکاری وفد کے ایک رُکن کی حیثیت سے سعودی عرب گئے جہاں انہوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مذہبی ارکان ادا کئے۔

☆ ستمبر ۱۹۹۷ء میں منعقدہ ''جشنِ مجتبیٰ حسین'' میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شارجہ دبئی گئے۔

☆ ۲۴ راپریل تا ۵ رجولائی ۲۰۰۰ء میں احباب کی دعوت پر دوبارہ امریکہ گئے اور امریکہ کے مختلف شہروں شکاگو، واشنگٹن، رچمنڈ، لاس اینجلس، نیوجرسی، ڈیٹرائٹ اور نیویارک وغیرہ کا دورہ کیا اور مختلف جلسوں میں شریک ہوئے خصوصاً شکاگو اور لاس اینجلس میں ان کے اعزاز میں جشن کا اہتمام کیا گیا۔

مجتبیٰ حسین اُردو ادب میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے ۱۹۶۲ء سے ہی کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۹۶۶ء میں *(All India Conferece of Humour Writers in Urdu)* کی میٹنگ منعقد کرائی اور ۱۹۶۷ء میں *Festival of Humour* کا انعقاد کیا۔ علاوہ ازیں ۱۹۸۵ء میں *Wold Humour Conference* کے انعقاد میں مدد کی۔

وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے بانیوں میں سے ایک ہیں اور اپنے ادبی سفر کے دوران مختلف

انجمنوں سے منسلک تھے اور ہیں۔اس کے علاوہ ۱۹۹۵ء میں کٹک میں آل اُڑیا رائٹر کانفرنس میں بہ حیثیت مہمان خصوصی مدعو کئے گئے ۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو، Radio (N. H. K, Doordashan, Canadian Japan Radio, Voice of America, B. B. C, وغیرہ پر بے شمار پروگرام نشر کئے۔ وہ چالیس برس پرانے براڈ کاسٹر ہیں اور ہندوستان میں ٹیلی ویژن کے آغاز کے ساتھ ہی انہوں نے پروگراموں میں شرکت شروع کردی تھی۔ ۸۰ کی دہائی میں انہوں نے قہقہہ کے عنوان سے دو سال تک پندرہ روزہ مزاحیہ پروگرام دلی دوردرشن سے پیش کیا۔ ای ٹی وی اردو نے ابھی حال ہی میں ان کے انشائیوں پر مبنی ایک مزاحیہ سیریل عجب مرزا' غضب مرزا پیش کیا ہے جو مقبول ہو رہا ہے۔ موصوف کو ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور ادب کی خدمت کے صلے میں کئی انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا گیا جن میں سب سے پہلا اعزاز اُڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم سرس ساہتیہ سمیتی کی جانب سے عطا کیا گیا۔

☆ ۱۹۸۰ء ہندوستانی ادب میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے اڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم 'سرس ساہتیہ سمیتی' کی جانب سے کٹک میں منعقدہ جلسے میں انہیں ہاسیہ رتن کا خطاب عطا کیا گیا اور ان کے مضامین کا ایک مجموعہ اڑیا زبان میں بھی شائع کیا گیا۔

☆ ۶ رجولائی ۱۹۸۲ء غالب انسٹی ٹیوٹ نے جب ''غالب ایوارڈ برائے طنز و مزاح'' دینے کا فیصلہ کیا تو اس سلسلے کے پہلے انعام کے مستحق مجتبیٰ حسین قرار پائے جسے ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کے ہاتھوں ایک خصوصی تقریب میں عطا کیا گیا۔

☆ ۱۹ رنومبر ۱۹۸۳ء ''بزم ساز و ادب دہلی'' نے انہیں ''نشانِ امتیاز'' سے نوازا۔

☆ ۱۹۸۹ء اُردو اکادمی دہلی کی جانب سے تخلیقی ادب کے لیے سب سے بڑا ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا جسے انہیں ۲۲ راگست ۱۹۹۰ء کو شنکر دیال شرما نے ایک خصوصی تقریب میں عطا کیا۔

☆ ۱۹۹۴ء اردو اکادمی آندھرا پردیش نے انہیں پہلے کل ہند ''مخدوم لیٹریری ایوارڈ'' کے لیے منتخب کیا۔

☆ ۲۶ راکتوبر ۱۹۹۶ء The Usmanians, U. S. A نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو ''نگار اُردو ایوارڈ'' سے نوازا۔

☆ ۹۸-۱۹۹۷ء ہریانہ اُردو اکادمی نے انہیں ''مہیندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے طنز و مزاح'' سے سرفراز کیا جسے ۲۰ رمئی کو ایک خصوصی تقریب میں گورنر ہریانہ مہاویر پرساد جی نے عطا کیا۔

☆ کرناٹک اردو اکیڈمی نے ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں یکم جون ۲۰۰۱ء کو بنگلور میں منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں انہیں اعزاز سے نوازا۔اس کے علاوہ ان کی سبھی کتابوں کو مختلف اردو اکامیوں کی طرف سے ایوارڈ سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔

☆ ۱۹۸۷ء میں پروفیسر شکیل الرحمن سابق وائس چانسلر'متھلا یونیورسٹی دربھنگہ نے 'مجتبیٰ حسین کا فن' کے نام کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جوان کے فن کے متعلق پہلی کتاب ہے۔

☆ اب جب کہ یہ کتاب شائع ہونے جارہی ہے' مجھے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر منظر کاظمی کی نگرانی میں ۱۹۹۷ء میں محمد افسر کاظمی نے اپنے مقالہ مجتبیٰ حسین کی طنز نگاری پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے جو کریم سٹی کالج کے شعبہ اردو میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہیں۔

☆ ۱۹۹۶ء میں ان پر ایک تحقیقی مقالہ گلبرگہ یونیورسٹی میں بھی لکھا گیا ہے جس کا عنوان مجتبیٰ حسین بہ حیثیت خاکہ نگار ہے۔یہ کام سردار پاشا نے جناب ڈاکٹر لئیق خدیجہ کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین عملی زندگی میں نہایت منکسر المزاج ' بے نیاز اور سیدھے سادے انسان ہیں۔وہ کبھی اپنے اور اپنی مزاح نگاری کے بارے میں اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے بلکہ کوئی ان کی تعریف کرے تو اپنے آپ کو شرمندہ سا محسوس کرتے ہیں۔اگر چہ انہوں نے نہایت بھرپور سماجی زندگی گزاری لیکن اپنی شخصی زندگی میں انہوں نے اپنی قلندرانہ شان کو برقرار رکھا' سماج کے ہر طبقہ کے نہایت بارسوخ ہستیوں سے ان کے بے تکلفانہ مراسم رہنے کے باوجود انہوں نے اس اثر ورسوخ کی اپنے احباب کی دست گیری کے لیے استعمال کیا لیکن کبھی اپنے لیے یا اپنے خاندان کے لیے کسی سے کچھ نہیں کہا۔انعامات و اعزازات کے حصول کے لیے ادبی ہستیاں نہ جانے کون کون سے طریقہ کار اختیار کرتی ہیں لیکن مجتبیٰ صاحب نے انعامات حاصل کرنے اور اعزازات پانے کے ان طریقوں سے ہمیشہ اجتناب برتا اور ۱۹۹۱ء میں این سی ای آرٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی انہوں نے مختلف پیش کش کے باوجود کہیں کوئی ملازمت اختیار نہیں کی اور حسب معمول مزاح نگاری کو'جو اب ان کی شناخت بن چکی ہے'

اختیار کیے رکھا۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء تک انہوں نے بھرپور سماجی زندگی گزاری لیکن دورۂ امریکہ سے واپسی کے بعد انہوں نے اپنے گھٹنے کی سرجری کرائی جو ناکام رہی۔ پہلی سرجری سے پیدا شدہ خامی کو دور کرنے کے لیے ان کی سرجری دوبارہ کی گئی لیکن بدقسمتی سے یہ بھی ناکام رہی۔ اس کے بعد سے مجتبیٰ حسین کی نقل و حرکت محدود ہوگئی ہے اور اس کا اثر ان کی عام صحت پر بھی دکھائی دینے لگا ہے۔ اب وہ سماجی محفلوں میں بھی بہت کم جاتے ہیں اور یوں انہوں نے مجبوراً گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے لیکن ان کا قلم ابھی بھی پہلے کی طرح رواں ہے جس سے وہ اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں جس کی بہترین مثال سیاست حیدرآباد میں شائع ہونے والا ہفتہ والا کالم 'میرا کالم' ہے جسے وہ آج بھی نہایت پابندی سے لکھتے ہیں۔

ماحصل یہ کہ مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کی ابتدا حیدرآباد سے ہوئی اور انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران مختلف طبقۂ فکر کے افراد اور اداروں سے رشتہ استوار رکھا۔ پھر بھی وہ اپنے زندگی کا ہر لمحہ شعوری یا لاشعوری طور پر حیدرآباد میں ہی گزارتے ہیں۔ ان کی زبان کا تانا بانا' ان کا لہجہ' ان کی حِسِ مزاح اور موضوعات سبھی حیدرآباد کی زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ اگر ان کی تحریروں' خاکوں' سفرناموں' کالموں اور مضامین وغیرہ کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ ہر شخص' ہر واقعہ' ہر حادثہ کو حیدرآبادی تہذیب کی عینک سے دیکھتے ہیں اور اسی سیر بین سے دوسروں کو بھی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے فن کی خوبی' خامی اور شناخت بھی ہے' ٹھیک اسی طرح جیسے رشید احمد صدیقی کی شناخت علی گڈھ ہے' فرحت اللہ بیگ کی شناخت دہلی ہے' مشتاق یوسفی کی شناخت ان کے بینک کی کرسی اور کھڑکی ہے (جہاں سے بیٹھے بیٹھے وہ نہایت خوش اسلوبی اور باریک بینی سے پوری دنیا پر نظر ڈالتے چلے جاتے ہیں)۔ اسی طرح پطرس بخاری کی شناخت زندہ دلان پنجاب اور لاہور سے' ابن انشا کی شناخت ذکرِ کراچی سے' شوکت تھانوی کی شناخت لکھنؤ سے' عظیم بیگ چغتائی کی شناخت راجستھان سے' محمد خالد اختر کی شناخت پنجاب اور شمالی پاکستان سے ہے جب کہ تخلص بھوپالی کی شناخت بھوپال سے ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مزاح مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے مثلاً مذہب' سیاست' ادب' کلچر' انسانی سماج کی بوالعجبیاں' سماجی رشتے ناطے وغیرہ۔ ان کے مزاحیہ مضامین گلی کوچوں سے اُبھرنے والے رنگا رنگ کردار' دوستوں اور سیاست دانوں کی بزم آرائیاں' پیشہ ورانہ آویزش' اشیائے خوردنی اور اسی طرح کے بہت سارے موضوعات پر مبنی ہیں جن پر موصوف نے اپنی

تحریروں میں اپنے مخصوص زاویہ نظر سے روشنی ڈالنے کی عمدہ کوشش کی ہے جس میں چستی، شوخی، بذلہ سنجی، ظرافت، خوش طبعی کے چھینٹے جا بجا بکھرے پڑے ہیں جس سے ان کے قاری کو ایک خاص قسم کا لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں آورد کا ذرّہ برابر بھی دخل نہیں اور وہ بھونڈے، اُچھل کود والے لطیفوں اور فقروں سے حتیٰ الامکان اجتناب برتتے ہیں جو انہیں دوسرے مزاح نگاروں سے منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

انہیں زبان کو مزاحیہ طریقہ سے برتنے پر قدرت حاصل ہے۔ وہ واقعات کے بیان میں جزئیات نگاری اور مواقع کی ڈرامائیت سے بہ خوبی کام لیتے ہیں۔ انہیں صورت حال کو اپنے طور پر برتنے کا ہنر آتا ہے۔ ان کا فن تجریدی نہ ہوکر حقیقت پسندانہ ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں مقامیت کا عنصر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرزِ زندگی ان کے مسائل اور ان کے مخصوص رویوں، عادتوں، خصائل کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر محاکات نگاری اور پیکر تراشی کے تمام وسائل مثلاً تشبیہ واستعارہ، رمز وکنایہ وصفات متعلقات وغیرہ کو بروئے کار لاکر ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ وہ ذہن میں اُتر جاتی ہے اور قاری یا سامع قہقہوں اور مسکراہٹوں کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ الغرض مجتبیٰ حسین مزاح نگاری کے وقار واعتبار کی ایک ایسی علامت ہیں جس کی پیروی آئندہ نسلیں بھی کرتی رہیں گی۔ ان کی انہیں خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے کرشن چندر نے کہا تھا:

> ''مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں۔ وہ جوان اور ذہین ادیب ہیں جو شائستہ اور نفیس ادب تخلیق کرسکتے ہیں۔ ان کے مزاح میں وہ تندی اور بے باکی نہیں جو طبیعت کو مکدر کردیتی ہے بلکہ وہ رچاؤ اور لطافت ہے جو پڑھنے والے کو کبھی زیرلب تبسم اور کبھی بلند آہنگ قہقہے کی دعوت دیتی ہے۔ مزاح نگاری ایک مشکل فن ہے اور مجتبیٰ حسین ان مشکلات سے بہ خوبی واقف ہیں''۔ [19]

☆☆☆

حواشی

مصنف یا مولف	تصنیف وتالیف	مقام اشاعت وسن اشاعت	صفحہ نمبر
ا۔حسن چشتی	مجتبیٰ حسین سے ایک ملاقات	بہ تاریخ ۹ر ستمبر ۱۹۹۴ء	
۲۔مجتبیٰ حسین	تکلف برطرف	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء	۹
۳۔ایضاً	"	"	"
۴۔کرشن چندر	ماہنامہ سب رس (جگر نمبر)	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	۱۵۴
۵۔مجتبیٰ حسین	تکلف برطرف	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء	۱۴۵
۶۔ایضاً	کتاب نما (جگر نمبر)	مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی	۳۵
۷۔ایضاً	آج کل (طنز ومزاح نمبر) جلد اول	نئی دہلی اپریل ۱۹۸۴ء	
۸۔مجتبیٰ حسین	تکلف برطرف	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء	۱۳
۹۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰
۱۰۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۔۱۱
۱۱۔کوہ پیا	روزنامہ سیاست	حیدرآباد ۲۷ر اگست ۱۹۶۲ء	
۱۲۔عبدالماجد دریابادی	صدق جدید		۹۶۔۹۷
۱۳۔مجتبیٰ حسین	تکلف برطرف	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء	۱۱
۱۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	۵۴
۱۵۔ایضاً	قصہ مختصر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۲ء	۱۴
۱۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۴۔۱۵
۱۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۵
۱۸۔شگوفہ جلد ۲۰	(مجتبیٰ حسین نمبر)	حیدرآباد ۱۹۸۷ء	۲۲۰
۱۹۔کرشن چندر	سوونیر جشن مجتبیٰ حسین	شارجہ دبئی ۱۹۹۷ء	

مجتبیٰ حسین : بہ حیثیت کالم نگار

کالم نگاری کو انفرادی صحافت Personal Journalism کہا جاتا ہے جس میں ترسیل و تخلیق کا بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں صحافیوں کو Political Pundit کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جن میں مارک سولیون، ڈیوڈ لارینس، والٹر لپ مین، ہے وڈ براؤن، ڈریو پیئرسن، روبرٹ ایس ایکین، پول میلن فرینک موریس، پیٹر ایڈیسن، ٹام اسٹوکس، فرینک۔ آر۔ کینٹ، پیگلر، وکٹر رائے سل، مارک سل وِن کاسٹنٹائن براؤن، ویسٹ بروک وغیرہ کافی مشہور رہے ہیں اور ان کی تحریریں کالم نگاری کے فروغ میں نہایت اہم مقام رکھتی ہیں۔

دراصل کالم ایک صحافتی فیچر ہوتا ہے جس میں کالم نویس منتخب موضوعات پر اپنے مخصوص لب و لہجے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کسی بھی معاملے کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جس کے ذریعے ہزاروں قارئین کو دعوتِ فکر دی جاتی ہے۔ اس کی سب بڑی خوبی یہ ہے اس میں کالم نویس نہ صرف اپنی آراء کا اظہار کرتا ہے بلکہ یہ بات بھی باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے جو رائے قائم کی ہے، اس کے پس پردہ کون کون سے اسباب و عوامل کارفرما ہیں۔ بقول سید اقبال قادری:

> ''ہر کالم نویس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریر میں ایک واضح انفرادیت قائم رکھے۔ اسے کسی بھی چیز کو بھانپ لینے کی عادت ہو۔ اسے تجزیہ نگاری سے رغبت ہو اور وہ اپنی ہی قوت تخلیق کے ذریعہ کالم کو استحکام بخشے''۔ [1]

کالم نگار اور کالم نگاری کے متعلق اپنے اس موقف کے ضمن میں انہوں نے اپنی تصنیف رہبر اخبار نویسی میں کالموں کی پانچ اقسام بتائی ہیں جو رنگ برنگا کالم' ذاتی کالم' مزاحیہ کالم' سنڈیکیٹ کالم اور خصوصی کالم پر مبنی ہیں۔ پیش ہے ان کی مختصر تفصیل جس سے ان کا مطمح نظر مزید واضح ہو جائے گا۔

رنگ برنگا کالم: اس قسم کے کالموں میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ ان میں مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے مثلاً اس قسم کے کالموں میں کالم نگار سیاسی' معاشی' ثقافتی' علمی و ادبی غرض کہ ایسے تمام موضوعات شامل کرسکتا ہے جو قاری کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچا سکیں۔

ذاتی کالم: اس قسم کے کالموں میں کسی ایک موضوع یا کئی موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے مگر ان تحریروں میں انفرادی اہمیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ان کالموں میں طوفان' سیلاب و دیگر حادثات اور انتخابات وغیرہ سے متعلق جائزے پیش کئے جاتے ہیں یا پھر Personal Advice مثلاً خاندانی مسائل' نفسیاتی مسائل' امراض وصحت سے متعلق صلاح' خوب صورت بننے کے راز وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ایسے کالم نویس موضوع سے متعلق اپنی تمام معلومات اطمینان بخش دلائل کے سہارے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کا پہلا ذاتی کالم The Herald Tribune میں ۸ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو شائع ہوا جسے والٹر لپ مین (Walter lipmann) نامی امریکی صحافی نے آج اور کل Today and Tomorrow کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ پانچ سو امریکی اخباروں نے بیک وقت یہ کالم شائع کرنا شروع کیا جو ذاتی کالم نگاری کی معراج تھی۔

مزاحیہ کالم: اس قسم کے کالم طنز و مزاح کی چاشنی لئے ہوتے ہیں جو سماج اور ماحول میں موجود خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قارئین کو ہنسنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں جس میں ایک قسم کا اصلاحی رُجحان بھی کارفرما ہوتا ہے۔ اُردو میں یہ سلسلہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار ''اودھ پنچ'' سے شروع ہوا اور آج بھی کئی اخباروں میں یہ سلسلہ جاری ہے مثلاً 'سیاست' حیدرآباد میں مجتبیٰ حسین کا مزاحیہ کالم ''میرا کالم'' ''عوام' دہلی میں جعفر عباس کا مزاحیہ کالم ''جام بکف'' ''نئی دنیا میں'' ''آئینہ'' وغیرہ۔

سنڈ یکیٹ کالم: ایسے کالم جو کسی خاص صحافی یا مضمون نگار کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ یہ آزاد قلم صحافیوں (Freelance Journalists) کے ذریعہ لکھے جاتے ہیں۔ ایسے کالم اخبار کو براہ راست نہیں ملتے بلکہ یہ سنڈ یکیٹ سے خریدے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں سنڈ یکیٹ کالم کہا جاتا ہے۔ ایسے کالموں سے سنڈ یکیٹ والوں کو کافی منافع ہوتا ہے کیوں کہ ایک ہی مواد کے لیے انہیں کئی اخبارات سے رقم مل جاتی ہے۔

خصوصی کالم: ایسے کالم خصوصی موضوعات پر لکھے جاتے ہیں مثلاً تجارت' زراعت' صوبائی سیاست' صنعت وحرفت' معماری' ماحولیات' مذہب' علم وادب' فلم' موسیقی' کشیدہ کاری اور فیشن وغیرہ۔ یہ کالم عموماً وہی افراد لکھتے ہیں جو اس میدان کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

کالم نویسی جدید صحافت میں اتنا اہم مقام رکھتی ہے کہ کئی بار کالم نویسوں کے تبصروں سے نہایت اہم اور پیچیدہ مسائل سُلجھا لیے جاتے ہیں۔ کالم نویسوں کی آراء کو بڑی بڑی حکومتیں بھی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتی ہیں اور کئی بار اہم مسلوں پر اُن کے رُجحان کا جائزہ لے کر فیصلے کرتی نظر آتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی کئی ایسے اہم کالم نگار ہیں جن کے کالموں کو کافی وقعت حاصل رہی ہے۔ ان میں خشونت سنگھ' آئی کے گجرال' پی چدمبرم' منی شنکر ایر' ایس سوامی ناتھن' موہت سین' ششی تھارور' مدھو کشور' برندا کرات' امرتیہ سین' کے آر ملکانی' این ایس راجہ رام' راچند رگوہا' آندرے بیتے' ترون تیج پال' پرکاش کرات' ایچ کے دوا' نوین چندرا' اسا پٹنائک' انور ابراہیم' این۔ جے۔ نان پوریا' ایم وی کامتھ' راجندر پوری' اقبال مسعود' کلدیپ نیر' پریم شنکر جھا' ہرش بھوگلے' امتیاز احمد' مچکند دوبے' میر اچنڈ یوک' آنند کمار' انور رادھا ایم چنائے' کومی کپور' جسجیت سنگھ' جے رام رمیش' رشمی سہگل' حامد انصاری' پی سائناتھ' سی پی چندر شیکھر' سی پی بھامبری' راجو سنتھانم' پرتاپ بھانو مہتا' میمن میتھو' گیل ایمویٹ' اتل انیجا' کانچا الیا' سی راجہ موہن' امیت بروا' سدھارتھ بردراجن' ہریش کھرے' راجیو دھون' رانا ایس صدیقی' نینا دیاس' ویر سنگھوی' دلیپ پڈ گاؤنکر' پربھو چاوَلہ' شیکھر گپتا' ونود مہتا' چندن مترا' راج دیپ سردیسائی' سری نواسن جین' وکرم چندرا' سی وشوناتھن' اروندھتی رائے' سچیتا دلال' کرن بیدی' بچی کٹاریہ' کے ایم پانکر' مشیر الحسن' ورون داس گپتا' کے لکشمن' پی ایس سوریہ نارائن' پارتھا سارتھی' کے سبرانیم' این رام' ایتابھ متّو' ارجن مینن گپتا' وی کرشنا' ہرش ماندر' ایچ ڈی سوری' تولین سنگھ' ویدیہ ناتھ مشرا' منور ما مہاپاترا' راجیو چگ' شہناز حسین' مہر بھسین' سنیل گواسکر' پرتیش نندی'

ارون شوری، شوبھا ڈے، نکہت کاظمی، اچن وناتک، کانتی واجپئی، راجندر یچر، ظفر آغا، اصغر علی انجینئر، دیپانکر گپتا، پربھات پٹنائک، پبن چندرا، نامور سنگھ، مرنال پانڈے، پرفل بدوئی، نئور سنگھ، کپل سبل، ارون جیٹلی، ارون شوری، سلمان رشدی، سوامی اگنی ویش، جگ سوریہ، امولیہ گانگولی، رومیلا تھاپر، زویا حسن، جیتی گھوش، سوم آنند، راجندر یادو، پربھاش جوشی، ہمنت جوشی، نلنی سنگھ، عزیز برنی، ماجد رمن، شاہد صدیقی، گوند دیکشت، انبساط احمد علوی، مشتاق احمد ایڈوکیٹ، نفیس احمد، معصوم مرادآبادی، سراج نقوی، اسد رضا، مظفر حسین برنی اور کے۔کے۔ کھلر، دلیپ وینگسر کر، روی شاستری، کپل دیو وغیرہ اہم ہیں۔

میرا موضوع مزاحیہ کالم نگاری ہے جس میں طنز اور مزاح دونوں ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس امر سے ہم بہ خوبی واقف ہیں کہ طنزیہ ومزاحیہ ادب *Sugar Coated* کونین کے مثل ہے جس کے سہارے کوئی بھی ادیب ایسی تخلیقات پیش کر سکتا ہے جس سے ان امراض کی اصلاح ہو سکے یا ان کی طرف توجہ مبذول کرائی جا سکے جس سے سماج اور عوام دوچار ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزی سامراج نے جب اظہار و بیان پر پابندی لگا دی اور سیاسی جدوجہد پر پہرے بٹھا دیئے تو ہمارے قلم کاروں نے اس صنف کا سہارا لیا اور اسے ان تمام ہندوستانیوں کا ترجمان بنا دیا جو سیاسی، معاشی واقتصادی بدحالی کا شکار تھے۔ اس ضمن میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار اودھ پنچ جنوری ۱۸۷۷ء نے کافی اہم اور نمایاں خدمات انجام دیں اور طنزیہ ومزاحیہ کالم شروع کر کے ایک ایسی روایت کو فروغ دیا جو آج بھی جاری وساری ہے۔ اودھ پنچ کے ایک اقتباس کو بہ طورِ ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے جس میں عوام کی پریشانیوں کا ذکر بڑے ہی لطیف اور موثر انداز میں کیا گیا ہے:

> ''ایک تو گرانی، دوسرے بنیوں کی یہ مہربانی کہ وزن بانٹوں سے تولتے ہیں۔ لکھنؤ کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس جرم میں چہارشنبہ گزشتہ عدالت سٹی مجسٹریٹ سے چھ بنیوں کو چھ ہفتہ قید کی سزا ملی۔ ۱۵ر اکتوبر کو انسپکٹر پولیس فتح گنج بنیوں کے بانٹ جانچ رہے تھے کہ ان لوگوں نے کیا فقرہ چست کیا (افواہ اُڑائی) کہ امین آباد لٹا جا رہا ہے۔ بنیوں کا غلّہ لوگ لے جاتے ہیں۔ دوڑیو، دوڑیو---- اور یہ کہہ کر سب نے دکان بند کر لیں کہ بانٹوں کا فریب کھلنے نہ پائے۔ پولیس والے امین آباد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی

جان بچی ورنہ اس روز قلعی کھل جاتی''[۲]

اخبار اودھ پنچ کی طنزیہ تحریروں نے مزاحیہ کالم نگاری کو ایک تحریک کی شکل دے دی اور زمانے کے ان سماجی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کو موضوع بنایا جو اب تک اُردو نثر میں ناپید تھیں۔ اس کا اثر ملک گیر پیمانے پر ہوا جس کا ثبوت وہ اخبارات ہیں جو ہندوستان کے کونے کونے سے نکلنے شروع ہوئے تھے۔ جس میں ''پنجاب پنچ' لاہور پنچ' جالندھر پنچ' بنارس پنچ' آگرہ پنچ' دکن پنچ وغیرہ اہم ہیں۔ خصوصاً ''اودھ پنچ'' کے قلم کاروں میں کئی تو ایسے ہیں جو اپنے آپ میں طنز و مزاح کی تاریخ کا روشن باب کہلانے کے مستحق ہیں مثلاً پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجرؔ، مچھو بیگ ستم ظریفؔ، منشی جوالا پرساد برقؔ، احمد علی شوقؔ، سید محمد آزادؔ، عبدالغفور شہبازؔ، احمد علی کسمنڈوی اور خود اس اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین نے اپنے تیز اور دھار دار قلم سے ایسی شستہ اور دل فریب تحریریں لکھیں جس میں سماجی کرب کے ساتھ ساتھ شائستہ لیکن شدید احتجاج دونوں ہی تھا۔ یہ احتجاج ایسا اسلوب لیے تھا جو سمجھ میں سبھی کے آتا لیکن قابلِ گرفت نہ ہوتا۔ بہ قول اکبر الٰہ آبادی:

شاہدِ معنیٰ نے اوڑھا ہے ظرافت کا لباس

اس طرح ظرافت کے لبادے میں ہمارے قلم کاروں نے اپنے معاشرے کے دکھ درد، خوشی و غم، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کو موضوع بنایا اور ان موضوعات سے آگہی حاصل کر کے روز مرہ کے واقعات و حادثات کو اپنے طنز کا نشانہ بھی، جس سے سیاسی، سماجی و معاشرتی سبھی سطحوں پر فائدہ اٹھایا جا سکے اور اس معاشرے میں بیداری لائی جا سکے جو روبہ زوال تھی۔ اودھ پنچ کے ان قلم کاروں کی روایت کو آگے بھی برقرار رکھا گیا اور یہ سفر آج بھی جاری ہے۔ پیش ہے چند مشاہیر قلم کے منتخب کالموں کے عنوانات جس کے ذریعہ انہوں نے مزاحیہ کالم نگاری میں نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔

اخبار فتنہ میں ریاض میکسار کا کالم فتنہ، عطر فتنہ، کے مضمون نگاروں کے کالم منادی زمین دار، کے خواجہ حسن نظامی کا کالم جھینگر کا جنازہ، حاجی لق لق کے کالم، انقلاب میں عبدالمجید سالک کا کالم افکار و حوادث ''شیرازہ'' میں چراغ حسن حسرت کے کالم ''ہند سماچار میں کنہیا لال کپور کے کالم ''ملاپ'' میں فکر تونسوی کا کالم پیاز کے چھلکے تخلص بھوپالی کا کالم پاندان والی خالہ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا کالم عنقا امروز میں ابراہیم جلیس کا کالم اخبار جنگ میں، جعفر عباس

کا کالم جام بکف روزنامہ عوام دہلی اور ہفتہ وار نئی دنیا دہلی میں آئینہ وغیرہ اسی طرح حیات اللہ انصاری کا کالم گلوریاں قومی آواز لکھنؤ میں جسے بعد میں مجیب سہالوی نے بھی لکھا۔ اس طرح شاہد صدیقی کا کالم شیشہ و تیشہ 'سیاست' حیدرآباد میں شائع ہوتا تھا جسے ان کے بعد مجتبیٰ حسین نے کوہ پیا کے فرضی نام سے لکھا۔ ان کے علاوہ نصرت ظہیر کا ''بقلم خود' قومی آواز دہلی' خوشتر گرامی کا کالم 'تیرونشتر' بیسویں صدی میں یوسف ناظم کا کالم اتوار یہ انقلاب ممبئی' اسی طرح تکبیر مشفق خواجہ خامہ بگوش کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھتے ہیں جس کا عنوان سخن در سخن ہوتا ہے۔ آج کل مجتبیٰ حسین کا کالم 'میرا کالم' سیاست حیدرآباد نہایت مشہور و معروف ہے۔

مدعا یہ کہ اگر ان کالموں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ہم ایک ایسی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں جو ماضی سے لے کر حال تک کی روداد کہی جا سکے گی۔ جس میں سماجی' سیاسی و معاشرتی حالات پر بھرپور تبصرہ بھی مل جائے گا اور اس عہد کے سماجی' تاریخی اور عوامی رُجحانات کا ایک خاکہ بھی جو فکر و نظر کے نت نئے دریچوں کو روشن کرنے کی صلاحیت سے معمور ہوگا۔

اس کتاب کے پہلے باب ''مجتبیٰ حسین: سوانح اور طنز و مزاح نگاری'' کی ابتدا میں میں نے یہ اشارہ کر دیا تھا کہ مجتبیٰ حسین صحافت سے مزاح نگاری کے میدان میں آئے یعنی انہوں نے سیاست کے مزاحیہ کالم نگار شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد شیشہ و تیشہ لکھنا شروع کیا۔ ہوا یوں کہ شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد روزنامہ سیاست حیدرآباد کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ وہ ایسا مزاح نگار کہاں سے لائے جو شیشہ و تیشہ اسی آب و تاب کے ساتھ لکھ سکے۔ اس ضمن میں کافی تجربے کئے گئے اور مختلف لوگوں کو یہ کالم لکھنے پر مامور کیا جاتا رہا' ایک دن وہ بھی آیا کہ مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے ہی انہیں یہ کالم لکھنے کا حکم صادر فرمایا اور اسی دن سے یہ کالم لکھنا ان کی ذمہ داری بن گئی۔ اس واقعہ کا ذکر مجتبیٰ حسین 'میرا کالم' میں یوں کرتے ہیں:

> ''مجھے ۱۲/اگست ۱۹۶۲ء کا وہ دن آج بھی یاد ہے جب میں حسب معمول اپنے کام پر دفتر سیاست پہنچا تو میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور عابد علی خاں ایڈیٹر نے مجھے ہدایت دی کہ میں اس دن کا طنزیہ کالم 'شیشہ و تیشہ' لکھ دوں۔ یہ محض اتفاق تھا۔ میں نے سوچا کہ اخبار میں بہت سارے کام چلاؤ کام کرنے پڑتے ہیں چلو یہ کام بھی کر دیتے ہیں''۔[۳]

اس طرح ۱۲ راگست ۱۹۶۲ء کوانہوں نے پہلا مزاحیہ کالم ایک فرضی نام ''کوہ پیما'' کے قلمی نام سے لکھااور اس طرح وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک معتبر کالم نگار بن گئے۔ ان کے کالموں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے صاحبِ طرز ادیب نے 'صدق جدید' میں مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کئے تھے جسے آج بھی مجتبیٰ حسین اپنے کالم نگاری کی سند مانتے ہیں۔

رہنمائے دکن اب دکن کا ایک معروف ومقبول روزنامہ ہے۔ دوسرا قابل ذکر روزنامہ سیاست خاصا سنجیدہ' شریفانہ' معقول' پُر معلومات پرچہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ظریفانہ کالم خوب سنبھالے ہوئے ہے ورنہ لوگ ظرافت اور توہین' دل آزاری یا پھکڑ پن کے درمیان فرق ہی نظرانداز کرجاتے ہیں''۔[۴]

مجتبیٰ حسین نے اپنی مزاح نگاری سے پہلے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک ایک صحافی کے طور پر کام کیااور کافی شہرت حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے فلمی تبصرے' کتابوں پر تبصرے' سیاسی تجزیے اور معلوماتی مضامین وغیرہ بھی تحریر کئے۔ پیش ہے ان کے مزاحیہ کالم کا ایک نمونہ جسے انہوں نے ''کوہ پیما'' کے نام سے لکھا تھا۔

یورپ میں گونگوں' بہروں' اندھوں اور دردمندوں کی انجمنوں کی کوئی کمی نہیں ہے بلکہ ایک ڈھونڈو ہزار انجمنیں مل جاتی ہیں لیکن ''زندہ دلانِ پیرس'' نے نئی وضع کی اکیڈمی قائم کی ہے جس کا مقصد فرانس میں ہنسی کو فروغ دینا ہے۔ اس اکیڈمی کے بے شمار اغراض ومقاصد میں سے ایک حقیر مقصد یہ بھی ہے کہ یکم اپریل کو عام تعطیل دلوانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا جائے تاکہ اس دن فرانس کے سارے باشندے فلک شگاف قہقہے بلند کرتے رہیں اور سرزمین فرانس زعفران زار بن جائے ------ اس اکیڈمی کا طریقہ کار کیا ہوگا' اس کا اندازہ لگانا قبل ازوقت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ارکان اس کے جلسوں میں تقریریں کرنے کی بجائے صرف قہقہے لگاتے رہیں۔ زبان کا کام مسکراہٹ سے لیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس اکیڈمی کے کسی رکن کا انتقال پرمسرت ہوجائے تو تعزیتی جلسوں کے بجائے مسرت وانبساط کے جلسے منعقد کئے جائیں۔ ابھی یہ اکیڈمی صرف ایک مسکراہٹ ہے جب بڑھ کر قہقہہ بن جائے گی تو دنیا کی سبھی انجمنیں پکار اُٹھیں گی:

''تمہیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں''۔[۵]

موصوف ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک لگاتار ۱۵ سال تک مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ روزانہ کی مشقت وریاضت نے ان کے فن کو ایک نئی اور انوکھی شکل دے دی جوان کے ہمعصر کالم نگاروں میں شاید و باید ہی پائی جاتی ہے۔اس امر سے سبھی واقف ہیں کہ روزانہ ایک نئے موضوع پر بالکل نیا کالم لکھنا نہایت ہی دشوار کام ہے جسے کوئی نہایت ہی حساس ذہن اور رواں قلم کا حامل شخص ہی انجام دے سکتا ہے یعنی ایسے کالم وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے موضوعات میں تنوع اور وسعت ہو اور جو انتہائی درجہ کا سماجی شعور بھی رکھتا ہو کیوں کہ ہر معاشرے اور سماج میں بے شمار حادثات و واقعات ایسے ہوتے رہتے ہیں جن پر نظر رکھ کر دلچسپ مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔مجتبیٰ حسین نے اپنی عُقابی نگاہوں، عمیق مشاہدے اور بے باک قلم سے کئی عمدہ کالم لکھے ہیں اور قاری کے ذہنوں کو اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے جواُن کے باظرف پیرایۂ اظہار کا مرہون منت ہے۔انہوں نے لکھا بھی ہے کہ:

"کالم نگاری کے لیے ظریفانہ کالم نگار کا صرف ظریف ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہے۔کالم نگار جب تک اپنے اور زمانے کے غم کو انگیز نہیں کرلیتا، سچی اور اچھی کالم نگاری نہیں کرسکتا"۔[۶]

کالم نگاری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"طنزیہ کالم نگاری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کالم نگار کو زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل نہ ہو اور وہ ادب کی کلاسیکی قدروں سے واقف نہ ہو"[۷]

مندرجہ بالا اقوال کی روشنی میں مزاحیہ کالم نگاری سے متعلق ان کا مطمحِ نظر ہمارے سامنے واضح ہوجاتا ہے جس میں ادبی حسن نہایت اہم ہے کیوں کہ اگر کالموں میں ادبی حُسن اور ادبی معیار برقرار نہیں رہ پائے گا تو وہ دوسرے تمام کالموں کی طرح اخبار کے ساتھ ساتھ باسی ہوجائیں گے۔مجتبیٰ حسین کے کالموں کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ باسی ہونے کی صلاحیت سے عاری ہیں ورنہ ان کے مزاحیہ کالموں کا مجموعہ "میرا کالم" قارئین کے ہاتھوں میں نہ ہوتا اور ایک ادبی تخلیق کی طرح نہ سراہا جاتا۔میرا کالم پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ کہ یہ کسی ادبی تخلیق سے کم نہیں ہے جو ہمیشہ تروتازہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ان کی اس تخلیقی توانائی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے کالموں کا مواد اپنے گردوپیش کے واقعات وحادثات، رُجحانات و

میلانات سے اخذ کرتے ہیں اور اسے تھوڑے سے مبالغہ کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔انہوں نے اپنی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''میرا کالم'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

''جب فوٹو گرافی میں *Enlargement* کو برا نہیں سمجھا جاتا تو اسے ادب میں کیوں بُرا سمجھا جائے۔سچ تو یہ ہے کہ میرے مضامین میں جو باتیں ہوتی ہیں، وہ سب کی سب سچی ہوتی ہیں۔میری کارستانی صرف یہ ہوتی ہے کہ میں انہیں ذرا سا ان لارج کردیتا ہوں۔میں فکشن نہیں لکھتا بلکہ فیکٹ اور فکشن، دونوں کو ملا کر فیکشن **(Faction)** لکھتا ہوں''۔ [۸]

ملاحظہ فرمائیں ''اُردو جیل میں پہنچ گئی'' کا ایک اقتباس جس سے مجتبیٰ حسین کے اس بیان کی تصدیق ہوجائے گی کہ وہ فیکشن لکھتے ہیں اور انہیں نہ صرف زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے بلکہ وہ کلاسیکی ادب سے بھی بہ خوبی واقف ہیں:

''اردو کے جیل میں جانے کی اب جو ہم یہ خوش خبری سنا رہے ہیں، اس کا تعلق اصل میں اُردو کی ان گرمائی کلاسوں سے متعلق ہے جنہیں کچھ عرصہ پہلے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے حیدرآباد میں زور و شور سے شروع کیا گیا تھا۔اس کا اثر ہندوستان کے دیگر علاقوں پہ بھی پڑا۔ دہلی کی اُردو اکیڈمی مختلف محلوں میں اردو کلاسز چلواتی آئی ہے لیکن جوش جنون میں دہلی اُردو اکیڈمی کے سکریٹری اور ہمارے دوست زبیر رضوی نے اسے جیل بھی پہنچا دیا ہے۔زبیر رضوی اردو کے شاعر ہیں اور وہ اس نکتہ سے بہ خوبی واقف ہیں کہ شاعری اور جیل کا آپس میں کیا تعلق ہے۔حسرتؔ موہانی جیل میں تھے تو انہوں نے چکّی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رکھی تھی۔ہمارے فیض احمد فیضؔ جیل آتے جاتے نہ رہتے تو اُردو ادب کو ''زنداں نامہ'' نہ دے سکتے تھے۔مخدومؔ نے بھی جیل جا کر اچھی شاعری کی۔غالبؔ چوں کہ اپنی شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے غالبؔ نے قمار بازی کے جُرم میں حوالات کی ہوا کھانے کو ضروری سمجھا۔غرض جیل اور اُردو شاعری کا رشتہ بڑا پُرانا ہے۔زبیر رضوی نے سوچا

کہ کیوں نہ جیل کے قیدیوں کو اُردو پڑھائی جائے تا کہ انہیں پتا چلے کہ گوشہ میں قفس کے کتنا آرام ہوتا ہے''۔9

مزاحیہ کالم نگاری کو ہندوستان سے کہیں زیادہ پاکستان میں فروغ حاصل ہوا کیوں کہ وہاں کے عوام کو آزادی کے تقریباً فوراً ہی بعد ایسے سیاسی نظام کا سامنا کرنا پڑا جس میں کھل کر بات کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے وہاں کے ادیبوں اور دانشوروں نے طنزیہ ومزاحیہ کالموں کے ذریعہ اپنی بات کہنی شروع کی جن میں حکومت کی پالیسیوں اور عمّال وحُکام پر نکتہ چینی کی گئی اور ان مضحکہ آمیز پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی، جن سے عوام دوچار تھے۔ ساتھ ہی ساتھ قارئین کو غور وفکر کی دعوت بھی دی گئی اور ان کی ذہنی تربیت کا سامان بھی فراہم کیا گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اخبارات میں مزاحیہ کالم نگاری کو مستقل حیثیت حاصل ہوگئی اور اس کالم کو اخبار کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا اور ان کالم نگاروں کو بھی کافی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا گیا جو مزاحیہ کالم لکھنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان معزز کالم نگاروں میں مشفق خواجہ، انتظار حسین، ابراہیم جلیس، عطاء الحق قاسمی، اختر زماں، محسن بھوپالی، شبنم رومانی، انجم اعظمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

پاکستانی صورت حال کے علی الرغم ہندستان میں مزاحیہ کالم نگاری کو اتنا فروغ نہ مل سکا جس کی خالص وجہ یہاں کا جمہوری نظام حکومت ہے جہاں ہر شخص کو آزادئ خیال اور اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں اپنی بات بہ بانگِ دُہل کہنے کے مواقع میسر ہوں، اشاروں اور کنایوں کا سہارا کون لے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی کالم نگاروں کے مزاحیہ کالم قاری کو ذہنی تسکین کا سامان بہم پہنچانے اور اس کی ضیافت کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں، نہ کہ کسی خاص مقصد کے لیے حالاں کہ پس پردہ وہ ساری باتیں بھی کی جاتی ہیں جو طنزیہ ومزاحیہ کالم کی خوبی ہیں۔ ہندوستان میں سیکڑوں اُردو اخبارات روزانہ شائع ہوتے ہیں لیکن چند اخباروں میں ہی مزاحیہ کالم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان اخبارات میں سیاست سرِفہرست ہے جو ابتداء سے ہی مزاحیہ کالم شائع کرتا چلا آرہا ہے۔ شروع میں اس کا مزاحیہ کالم شیشہ وتیشہ شاہد صدیقی لکھا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ کالم مجتبیٰ حسین نے کوہ پیما کے فرضی نام سے لکھا۔ بعد ازیں اصل نام سے لکھنے لگے اور لگاتار پندرہ برسوں تک لکھتے رہے۔ سرکاری ملازمت سے یہ سلسلہ رُک سا گیا تھا لیکن اب پھر ملازمت سے سبکدوش

ہونے کے بعد ۱۲/ اگست ۱۹۹۳ء سے انہوں نے سیاست سنڈے ایڈیشن میں شائع ہونے والے ادبی میگزین کے لیے مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا ہے جو ''میرا کالم'' کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کالم میں خاص بات یہ ہے کہ یہ اکثر و بیشتر ادبی موضوعات کا احاطہ کئے ہوتا ہے جس میں ہلکے ہلکے طنز اور میٹھے میٹھے مزاح کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ''کتاب نما'' میں بھی ان کے مزاحیہ کالم شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پیش ہے کتاب نما کا ایک اقتباس:

''اگر چہ یہ بات مشہور ہے کہ ہند کے شاعروں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تخلیقات میں وہ بھر پور عورت نظر نہیں آتی جو ہمیں عام زندگی میں دکھائی دیتی ہے۔ اس پر کسی نے کہا افسانہ نگار کے اعصاب پر عورت کا سوار ہونا ایک الگ بات ہے اور اس کا اعصاب سے اُتر کر ادب میں چلے آنا بالکل دوسری بات ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کے اعصاب پر جس طرح کی عورت سوار ہے 'وہ وہیں بیٹھی رہے تو اچھا ہے۔ ایسی عورت کا ادب میں کیا کام' ''[10]

جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاری کا سفر کالموں سے شروع کیا تھا جو دو ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلے دور میں انہوں نے ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۵ برس تک لگاتار مزاحیہ کالم لکھے اور پھر ۱۹۹۳ء سے سنڈے ایڈیشن کے لیے کالم لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح یہ سفر آج بھی جاری ہے۔ اس درمیان میں لکھے گئے چند منتخب کالموں کا ایک مجموعہ ''میرا کالم'' کے عنوان سے ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا ہے جس میں ۵۶ عنوانات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ''تماشائے اہلِ کرم'' ۱۹ عنوانات پر مشتمل ہے جس میں آم اب عام نہیں رہے' کتوانسان سے خبر دار رہو' قصہ ایک ہم شکل کا وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔

دوسرے حصے ''تماشائے اہل کرم'' میں ۱۴ عنوانات ہیں۔ قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتے ہیں اور اسے شروع سے آخر تک اپنے حصار میں لئے رہتے ہیں۔

اس مجموعہ کا آخری حصہ ''تماشائے اہلِ قلم'' ہے جس میں چند کالموں کو چھوڑ کر تقریباً سبھی کالموں میں کسی نہ کسی قلم کار کو یا ان کی تحریروں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان سبھی کالموں میں حسنِ بیان اور واقعہ نویسی کا ایسا انداز بیان دیکھنے کو ملتا ہے جو انہیں ان کے ہم عصر کالم نگاروں میں

ممتاز و منفرد مقامِ عطا کرتا ہے۔ پیش ہے ''پروین شاکر کی یاد میں'' سے ایک تراشا جس سے آپ مجتبیٰ حسین کے کالموں کی سحر بیانی کے معترف ہو جائیں گے:

''ہم نے جی ہی جی میں سوچا کہ ایسی دھان پان لڑکی کیا شعر کہہ سکے گی۔ جب اس مخصوص بیٹھک میں ان کے کلام سنانے کی باری آئی تو ہم نے فرمائش کی کہ وہ ترنم سے کلام سنائیں۔ اس پر وہ بولیں ''معاف کیجئے میں ترنم سے محروم ہوں''۔ ہمیں اس جملے پر سخت حیرت ہوئی کیوں کہ ہماری اکثر شاعرات ترنم سے کلام نہیں سناتیں بلکہ اپنے کلام سے ترنم سناتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلی بار ہم نے ایک خاتون شاعر کو تحت اللفظ شعر پڑھتے دیکھا اور سنا۔ پروین شاکر نے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

پا بہ گِل سب ہیں رِہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون؟

غزل ختم ہوئی تو ہمارے شاعر دوست بشیر بدر نے کہا۔ ''محترمہ ایسی مردانہ غزل کہی ہے کہ ہمیں تو چوڑیاں پہن لینی چاہئے''۔ اس پر پروین نے کہا ایسی بات ہے تو آپ کو ایک زنانہ غزل سناتی ہوں۔ پھر پروین نے سچ مچ ایک زنانہ غزل سنائی اور یوں ہمارے دوست کے ہاتھوں میں سے چوڑیاں اُتار لیں''۔ [11]

مجتبیٰ حسین کے کالموں میں سماجی شعور اپنے نقطہ عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کالموں میں سماج کے مختلف رُجحانات کو بڑی چابکدستی سے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں مثلاً طلباء کا امتحان میں نقل کرنے کا رجحان، عید کے چاند کے سلسلے میں گڑبڑ، پانی کی سربراہی کا اچانک بند ہو جانا، محکمہ موسمیات کے انکشافات، تھوکنے کے آداب و اطوار، رشوت سے متعلق سماجی رُجحانات اور اسی قسم کے عام موضوعات میں وہ اپنے قوتِ تخیل سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں اور آن کی آن میں ان واقعات کو اپنے موضوع کے موافق اس طرح تراش لیتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی مضحکہ آمیز پہلو پیدا ہو جائے مثلاً ایک شخص نے ڈاکٹر سے ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی اور جب ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی تو اس شخص نے گولی چلا دی۔ اس واقعہ کو انہوں نے کس مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''ہوسکتا ہے کہ سڑک پر چلتے چلتے کوئی آپ کو سلام کرلے اور آپ جلدی میں جواب نہ دے سکیں تو فوراً پستول چلنے کی آواز آئے گی اور گولی آپ کے سینے کے پار ہو جائے گی۔ مثلاً آپ نے کسی دوست کو کوئی اچھا سا شعر سنایا اور اس دوست نے اس شعر پر پھڑک کر اچانک پستول چلا دیا یار! غضب کے شعر کہتے ہو خدا تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظرِ بد سے بچائے۔ اگر ایسی چھوٹی موٹی باتوں کے لیے بھی پستول استعمال ہونے لگا تو وہ دن دور نہیں جب دنیا میں فیملی پلاننگ کی کسی اسکیم کی ضرورت باقی نہ رہے گی''۔ ۱۲

ان کی مزاحیہ کالم نگاری کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات میں تناسب توازن اور تضاد کے عناصر بھر دیتے ہیں اور ان کے ذریعے ایسی کاری ضرب لگاتے ہیں جس سے قاری لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور اس میں ایک مثبت رویہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی تقریباً ہر تحریر میں ایک قسم کا کرب موجزن ہوتا ہے جس پر وہ اپنے منفرد لب ولہجہ کا لبادہ ڈال دیتے ہیں جس سے ایک عجیب قسم کی شائستگی پیدا ہو جاتی ہے ۔دیکھیں اگلا اقتباس جوان کے حساس ذہن اور اس کے اندر پیدا شدہ کرب کو بہ خوبی ظاہر کرتا ہے:

''ان دنوں نوجوان لڑکے، لڑکیوں سے نہیں بلکہ ان کے جہیزوں سے شادیاں کرنے لگے ہیں۔ ایک نوجوان کی یاد آرہی ہے جس نے اپنے ہونے والے خسر کو لکھا تھا کہ ''اسے جہیز میں ایک موٹر، ایک مکان، ایک ٹیلی ویژن اور ایک ریفریجریٹر دیا جائے اور جہیز کی ان چیزوں کو دینے کے بعد اگر آپ اپنی لڑکی کو دینا چاہیں تو ضرور دے دیں ورنہ لڑکی کے بغیر بھی میں ہنسی خوشی زندگی گزار سکتا ہوں'' ۱۳

بہ قول آرتھر کوئسلر طنز ومزاح کا ایک خاص وصف مبالغہ آمیزی Exaggeration ہے لیکن مزاح نگار کو یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ مبالغہ آمیزی طوالت اور غلو کے حصار میں نہ آجائے ورنہ یہ موضوع اور نفسِ موضوع دونوں کو مجروح کردے گی۔ ایک اچھے مبالغہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس طرح مبالغہ کرے جس پر حقیقت کا گمان ہونے لگے۔ مجتبیٰ حسین

اس پیمانے پر کھرے اُترتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہ تحریر جوان کے اس فن پر دلالت کرتی ہے۔

''جتنے پرچے ہوتے اتنی ہی شیروانیاں بھی سلوا لیتے تھے۔ معاشیات کی شیروانی' سماجیات کی شیروانی' سیاسیات کی شیروانی' اُردو کی شیروانی' نفسیات کی شیروانی' ہم امتحان کی تیاری شروع کرنے سے پہلے شیروانیوں کی سلوائی کا آغاز کردیتے تھے اور سچ پوچھئے تو شیروانی کی سلوائی ہی امتحان کی اصلی تیاری ہوتی تھی''۔[۱۴]

مندرجہ بالا اقتباس میں انہوں نے فیکشن یعنی *Fact + Fiction* کا عمدہ نمونہ بھی پیش کیا ہے اور مبالغہ آمیزی کی بہترین مثال بھی دی ہے کیوں کہ آج کل طالب علم نقل کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے نظر آتے ہیں جن میں یہ طریقہ بھی شامل ہوسکتا ہے جسے کوئی لکھ پتی طالب علم ہی آزما سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین لفظوں کو مزاحیہ انداز سے برتنے پر قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں اور ذرا سی تراش خراش سے اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کردیتے ہیں جیسے ''شیشہ و تیشہ'' کا یہ حصہ جس میں جلسوں اور مقررین کو ہدف طنز بنایا گیا ہے اور آؤ بھگت اور ضلع جگت سے ایک لطیف احساس بیدار کردیا گیا ہے۔

''ماضی میں جلسے ہوتے تھے تو مقررین کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اب انہیں صرف ڈائس پر بٹھایا جاتا ہے۔ پہلے آؤ بھگت ہوتی تھی تو اب ''ضلع جگت'' ہوتی ہے۔ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ منتظمین اور سیاسی قائدین خود ''چور دروازے'' سے ایسے جلسوں کے انعقاد کا انتظام کرتے ہیں گویا ''سامعین ست اور مقررین چست'' والا معاملہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے''[۱۵]

مجتبیٰ حسین اپنے کالموں میں لفظوں کی تکرار' لطائف' ضرب الامثال وغیرہ سے مزاح کی نئی نئی جہتیں روشن کرنے اور کبھی کبھی ایک لفظ یا جملہ سے مزاحیہ فضا تشکیل دینے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس جس میں محولہ بالا نکات پر بہ خوبی روشنی پڑتی ہے

''ان دنوں دنیا کی ہر شئے نہ صرف مقصدی بلکہ ہمہ مقصدی ہونے لگی ہے۔ مثال کے طور پر ادب مقصدی ہوتا ہے۔ فلمیں مقصدی ہوتی ہیں

اور پراجیکٹس ہمہ مقصدی ہوتے ہیں۔ مقصدی اور ہمہ مقصدی کی طرح
بے مقصدی کی ایک نئی اصطلاح وجود میں آئی ہے۔ مثلاً اب چوری کی
لاتعداد اقسام کو دو بڑے شعبوں مقصدی اور غیر مقصدی میں تقسیم کیا جانے
لگا ہے۔ مقصدی چوری تو وہ ہے جس سے ہمارے آباؤ اجداد بھی واقف
تھے اور ہم بھی واقف ہیں۔ غیر مقصدی چوری ذرا نئی بات ہے۔ جس کا مقصد
صرف یہ ہوتا ہے کہ

''مال صاف کرنے کے بجائے صرف ہاتھ صاف کیا جائے''۔ [16]

اس میں شک نہیں کہ موصوف لفظوں کی تکرار سے بہ خوبی کام لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہی
تکرار ان کے فن کو مجروح کرتی نظر آتی ہے اور ایک سقم بن کر اُبھرتی ہے جو ان کی خوب صورت
اور دل فریب تحریروں سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔ پیش ہیں چند مثالیں جس میں انہوں نے
ڈبیہ، جلوس اور جلوسوں وغیرہ کی تکرار کی ہے جس سے قاری کا ذہن بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین رعایت لفظی کے فن سے واقف نہیں ہیں۔

''اس خبر کو پڑھنے کے بعد ہم کافی دہشت زدہ ہو گئے۔ یہی وجہ ہے
کہ کل سڑک پر چلتے ہوئے جب ایک شخص نے ہم سے سگریٹ جلانے کے
لیے دیا سلائی کی ڈبیہ مانگی تو ہم نے بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ دیا سلائی کی
ڈبیہ اسے نکال کر دے دی اور قبل اس کے وہ ڈبیہ واپس کرتا، ہم وہاں سے
ایک میل آگے نکل گئے''۔ [17]

''یوں بھی جلوس میں ایسے افراد کی اکثریت ہوتی ہے جو صرف تفریحاً
جلوسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ایسے جلوسوں سے بہتر تو یہی ہے کہ گدھوں
کا جلوس نکالا جائے۔ پھر گدھوں کے جلوس میں شرکت کرنے کے لیے کوئی
معاوضہ بھی نہیں دینا پڑتا اور جیسے ہی لاٹھی چارج ہوتا ہے، جلوس منتشر
ہو جاتا ہے، گدھوں کے جلوس پر لاٹھی چارج شروع ہو تو گدھے اتنی آسانی
سے نہیں بھاگیں گے''۔ [18]

گزشتہ عبارتوں میں لفظوں کی بے جا تکرار کا ذکر تھا جس میں یہ خامی اُجاگر ہوئی تھی کہ وہ
رعایت لفظی پر قادر نہیں ہیں لیکن یہ بات درست نہیں کیوں کہ ہر فن کار یا ادیب کے یہاں

کچھ خامیاں تو راہ پا ہی جاتی ہیں اور پھر مجتبیٰ حسین جیسے ادیب کے یہاں اس قسم کی ایک آدھ مثالوں کا پایا جانا کوئی زیادہ بامعنیٰ نہیں لگتا کیوں کہ جو شخص اتنی روانی سے کالم لکھے' اس کے یہاں تو بے شمار خامیاں ہونی چاہئیں لیکن وہ ان ساری خامیوں کو خوبیوں میں بدلتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ''اب آم عام نہیں رہے'' کا یہ اقتباس جس میں رعایت لفظی کا فن پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے اور عنوان سے اختتام تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے:

> ''یوں بھی آم اور عوام میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا کیوں کہ دونوں ہی چوسنے کے کام میں آتے ہیں۔ سرکار' افسر' بیوپاری' پونجی پتی کون ہے جو عوام کو نہیں چوستا' آم کو چوسنے کے بعد کم از کم گٹھلی تو چھوڑ دی جاتی ہے مگر عوام کو ایسی بے دردی سے چوسا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو اس کی استھیاں بھی نہیں مل پاتیں'' ۱۹

ناقدین ادب کا خیال ہے کہ مزاح شائستگی کی ضد ہوتا ہے لیکن مجتبیٰ حسین کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے مزاحیہ کالموں میں طنز کی نشتریت کے باوجود بلا کی شائستگی ہے۔ اس کی مثالیں مزاج پُرسی ایک مشکل فن ہے' دوردرشن پر اب سچے اشتہارات آئیں گے' ستم کا کرم' کانگریسی ناراض کیوں ہوتے ہیں' اُردو پھر گھروں میں واپس آرہی ہے' افطار پارٹی کا دور دورہ' ایک ملاقات دیمکوں کی ملکہ سے وغیرہ میں دیکھنے کو مل جائیں گی۔ ملاحظہ فرمائیں چند اقتباسات' جس میں ادبی کتابوں اور ان کے مصنفین پر شدید طنز کیا گیا ہے پھر بھی موصوف ایک لطیف شائستگی برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں:

> ''اُردو سیکشن میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے کسی بھوت بنگلہ میں داخل ہو گیا ہوں' ڈرتے ڈرتے میں نے گرد میں اٹی ہوئی کلیاتِ میرؔ کھولی تو دیکھا کہ اس میں سے ایک موٹی دیمک بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دیمک نے کہا خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو میں دیمکوں کی ملکہ ہوں۔ ابھی ابھی محمد حسین آزادؔ کی ''آبِ حیات'' کا خاتمہ کرکے یہاں پہنچی ہوں' جس نے آبِ حیات پی رکھی ہو' اسے تم کیا مارو گے!

''قاتل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم''[20]

اس کے بعد دیمک کی ملکہ سے مصنف کا جو مکالمہ ہوتا ہے' وہ ادبی طنز کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ دیمک کی ملکہ کہتی ہے:

''تم اُردو کے مصنفین میں یہی خرابی ہے کہ تصویریں ہمیشہ اپنی نوجوانی کی چھپواتے ہو اور تحریریں بچوں کی سی لکھتے ہو''۔ مصنف نے پوچھا۔'' داغؔ دہلوی کے بارے میں تمہارا کیا خیال''بولی ان کا کلام گانے کے چکر میں اچھی خاصی بیبیاں طوائفیں بن گئیں۔ مجھے تو طبلہ اور سارنگی کے بغیر ان کا کلام سمجھ میں نہیں آتا۔''اور مولانا آزادؔ' بولی: زندگی بھر ٹھاٹ سے عربی لکھتے رہے اور لوگ اسے اُردو سمجھ کر پڑھتے رہے۔ عربی کے کسی ادیب کو اردو میں شاید ہی اتنی شہرت ملی ہو۔ دیباچوں میں شکریہ ادا کرنے کی بات آئی تو بولی: مجھے کہتے ہوئے لاج آتی ہے۔ اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کو تو اب میرے سوا کسی کا شکریہ نہیں ادا کرنا چاہئے کیوں کہ بالآخر میں ہی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہوں ورنہ ان لوگوں کو کون پوچھتا ہے۔
''یہ کہہ کر دیمکوں کی ملکہ کلیاتِ میرؔ کی گہرائیوں میں گم ہوگئی اور میں لائبریری سے باہر نکل آیا''۔[21]

مجتبیٰ حسین کسی بھی فن پارے کے لیے اچھے اسلوب اور بہترین طرزِ ادا کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے لکھا بھی ہے کہ:

''دنیا میں اب کوئی ایسی نئی بات نہیں رہ گئی جو کروڑوں برس پرانی دنیا میں پہلے نہ کہی گئی ہو۔ ارسطو اور افلاطون سے لے کر آج تک سب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے ساری باتیں کہہ دی ہیں۔ لہٰذا اب بات کی اہمیت نہیں رہ گئی۔ البتہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کس ڈھنگ سے اپنی بات کہہ رہے ہیں۔ ادب صرف اب ایک طرز ادا کا نام رہ گیا ہے''۔[22]

''میرا کالم'' کے مصنف نے اپنے اس قول کی روشنی میں قارئین کے مسرت کا سامان فراہم کرنے کے لیے کئی لوازمات کو بہ خوبی برتا ہے اور ایسے ایسے پیرایۂ بیان اپنائے ہیں جو زبان پر ان کی دسترس کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں لطائف' اشعار اور کبھی کبھی تو

واقعات میں بھی تحریف کر دیتے ہیں۔ پیش ہے ایک اقتباس:

''مرزا غالب بھی آموں کے دیوانے تھے۔ ایک ریسرچ اسکالر نے تو یہاں تک لکھ دیا۔ غالب آم کے موسم میں شعر نہیں کہتے تھے بلکہ صرف آم ہی کھاتے رہتے تھے بلکہ ایسے میں کوئی ڈسٹرب کرتا تو اس پر اپنے شعروں سے حملہ نہیں کرتے تھے، گٹھلی پھینک کر مارتے تھے۔ آم ہی ایک ایسا پھل ہے جس میں ایک ہتھیار چھپا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کے ایک دوست کو آموں سے چڑ تھی۔ ایک دن دونوں بازار سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ گلی میں پڑے ہوئے ایک آم کو گدھے نے پہلے تو سونگھا' کچھ سوچا پھر اُسے کھائے بغیر آگے کو نکل گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مرزا غالب کے دوست نے کہا ! دیکھئے غالب صاحب گدھا بھی آم نہیں کھاتا۔ اس پر غالب نے کہا حضور! میں جانتا ہوں گدھا ہی آم نہیں کھاتا''۔ ۲۳

مجتبیٰ حسین کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک لفظ پر اپنے پورے کالم کی عمارت کھڑی کرتے ہیں مثلاً تھوکنا منع ہے' میں انہوں نے تھوکنے کے آداب و اطوار کو موضوع بنایا ہے۔ اسی طرح مزاج پرسی کرنا ایک مشکل فن ہے میں' مزاج پُرسی کرنا اور مزاج پُرسی کروانا دونوں ہی کو ایک مشکل فن بنا دیا ہے۔ دیکھیں یہ مثالیں جوان کے اس فن پر دلالت کرتی ہیں۔

''بعض لوگ تھوکنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں یہ عبارت لکھی ہوتی ہے' یہاں تھوکنا منع ہے' وہاں لوگ سب سے زیادہ تھوکتے ہیں''۔ ۲۴

''کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک غیر ملکی دوست پہلی بار ہندوستان آئے تھے۔ دو تین دنوں میں انہوں نے یہاں کے لوگوں کو پان کی پیک تھوکتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہو کر ہم سے کہا! حیرت کی بات ہے اکثر ہندوستانی جگہ جگہ اپنے منہ سے خون تھوکتے رہتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اس بیماری کی روک تھام کیوں نہیں کی جاتی'' تو ہم نے سمجھایا تم جسے خون سمجھتے ہو۔ وہ اصل میں پان کی پیک ہے۔ بھلا ہم اتنی آسانی سے خون

کیسے بہا سکتے ہیں۔ہم نے تو اپنی جدو جہد آزادی میں بھی بڑی احتیاط سے خون بہایا تھا''۔[25]

''ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو مزاج پُرسی کروانے کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین تصور کرتے ہیں۔اس وقت ہمیں اپنے ایک دوست کی یاد آگئی جو سیاسی حلقوں میں بھی خاصی شہرت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ایک بار وہ بیمار پڑ کر اسپتال میں شریک ہوئے۔روزانہ سینکڑوں لوگ گلدستے، پھل وغیرہ لے کر ان کی مزاج پُرسی کو آتے رہتے مزاج پُرسی کرنے والوں کی باضابطہ فہرست مرتب ہوتی اور دوسرے دن اخباروں میں ان کے نام شائع ہوتے جیسے یہ مزاج پُرسی نہ کرتے تو ہمارے دوست کا زندہ رہنا محال تھا''[26]

''اپنے غمگین چہرے کی وجہ سے پرسہ تو ہم آسانی سے نپٹا لیتے ہیں لیکن مزاج پُرسی میں ہمیں بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ہم حیدرآباد پہنچے تو پتا چلا کہ ہمارے دوست ڈاکٹر مغنی تبسم بھی اس بار مزاج پرسی کروانے کے لیے ہماری آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔مغنی تبسم دوستوں کو یہ نادر موقع کم ہی فراہم کرتے ہیں۔کچھ دوست ایسے بھی ہیں جن کی مزاج پرسی پچھلے دو، تین برسوں سے لگاتار کرتے چلے آرہے ہیں لیکن نہ تو ان کا مزاج ٹھیک ہوا اور نہ ہی ہمارے انداز مزاج پرسی میں کوئی فرق آیا۔ایسی مزاج پرسیاں اب ایک دفتری معمول بن گئی ہیں لیکن مغنی تبسم کی مزاج پرسی کرنے کے تصور میں جو کشش تھی، وہ ہمیں سب سے پہلے ان کے پاس لے گئی۔اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ مغنی تبسم اپنی تحریروں میں ادیبوں اور شاعروں وغیرہ کی اکثر مزاج پرسی کرتے رہتے ہیں۔دو ایک بار ہماری بھی مزاج پرسی کر چکے ہیں ۔ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ان کی مزاج پرسی کر کے حساب کو بے باق کر دیں''۔[27]

مجتبیٰ حسین بات سے بات نکالنے بلکہ بات بنانے میں ماہر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم رواں اور دل پذیر ہوتے ہیں اور قاری کسی بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتا گو کہ وہ کبھی کبھی

موضوع سے بھٹک بھی جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ براہ راست موضوع پر آنے کے لیے 'یہ تو جملہ معترضہ تھا' یہ تو ایک لطیفہ معترضہ تھا' وغیرہ کہہ کر پھر سے موضوع سے رشتہ استوار کر لیتے ہیں جوان کی بے باکی کا ثبوت ہے۔ان کے مزاحیہ کالم' خاکے' سفرنامے' مزاحیہ مضامین سبھی میں ان کی یہ خوبی کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ اپنے مزاحیہ کالموں میں اپنا ذکر بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیاست کے ''سنڈے ایڈیشن'' کے مزاحیہ کالم کا عنوان ''میرا کالم'' رکھوایا ہے تاکہ وہ اس میں اپنی باتیں بھی کہہ سکیں۔ پیش ہے ایک اقتباس جس میں علی سردار جعفری کا ذکر کرتے کرتے وہ اپنے متعلق باتیں کرنے لگے ہیں:

> ''وہ اصل میں ہمہ وقتی ادیب ہیں۔ ہماری طرح جز وقتی ادیب نہیں جنہیں ادب لکھنے کے ساتھ ساتھ بجلی' پانی اور ٹیلی فون کے بل بھی جمع کرنے پڑتے ہیں۔ بال بچوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے' سودا سلف بھی لانا پڑتا ہے' کبھی کبھی بال بھی بنوانے پڑتے ہیں اور کبھی کبھی مجبوری میں ادبی محفلوں میں بھی جانا پڑتا ہے''۲۸

ماحصل یہ کہ مجتبیٰ حسین کے کالموں میں لطیف مزاح' شائستہ طنز' دانشورانہ ژرف نگاہی کے علاوہ اس فن کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے منفرد لب ولہجے اور اسلوب بیان کے تمام آزمودہ حربوں سے بھی بہ خوبی کام لیا ہے جو آج کل کے اُردو اخبارات میں ناپید سی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم حیات اللہ انصاری اور مجیب سہالوی کی ''گلوریاں'' فکر تونسوی کے کالم 'پیاز کے چھلکے' یا شاہد صدیقی کے کالم ''شیشہ و تیشہ'' کی طرح قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں اور اُردو اخبارات میں مزاحیہ کالم نگاری کا بھرم قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ان کے کالموں میں بلا کی تازگی اور تخلیقی قوت کا اظہار بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو ان کے تقریباً پانچ دہائیوں پر محیط تجربے اور مشاہدے کا مرہون منت ہے۔ اب جب کہ انہوں نے دوبارہ کالم نگاری شروع کر دی ہے۔ ایک ایسا دائرہ تخلیق دینے میں کامیاب ہیں جس میں خاکے' سفرنامے' طنزیہ و مزاحیہ مضامین' ادبی و سیاسی کالم سبھی کچھ شامل ہے جس کا مرکز ادبی طنز و مزاح ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱۔سید اقبال قادری	رہبر اخبار نویسی مارچ جنوری ۱۹۸۹ء		۳۲۵
۲۔اودھ پنچ	۲۹رمئی ۱۹۷۷ء	بحوالہ طنزیات و مضحکات۔از رشید احمد صدیقی	
۳۔مجتبیٰ حسین	میرا کالم	روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد ۲۷رجون ۱۹۹۹ء	
۴۔عبدالماجد دریابادی	صدق جدید	۱۹۶۳ء	۹۷_۹۶
۵۔کوہ پیما	شیشہ و تیشہ	روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۸راگست ۱۹۶۲ء	
۶۔مجتبیٰ حسین	میرا کالم	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' جون ۱۹۹۹ء	۲۹۰
۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً ایضاً	۲۹۰_۹۱
۸۔ایضاً	ایضاً	روزنامہ سیاست حیدرآباد جون ۱۹۹۹ء	
۹۔ایضاً	میرا کالم	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' جون ۱۹۹۹ء	۲۱۱_۱۲
۱۰۔ایضاً	ماہنامہ (کتاب نما)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ستمبر ۱۹۹۹ء	۵۱
۱۱۔ایضاً	میرا کالم	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد جون ۱۹۹۹ء	۱۸۷
۱۲۔کوہ پیما	شیشہ و تیشہ	روزنامہ سیاست' حیدرآباد	
۱۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً	
۱۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً	
۱۵۔ایضاً	ایضاً	ایضاً یکم ستمبر ۱۹۶۲ء	
۱۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً ۲۴راگست ۱۹۶۲ء	
۱۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً	
۱۸۔ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً	
۱۹۔مجتبیٰ حسین	میرا کالم	حسامی بک ڈپو' جون ۱۹۹۹ء	۱۵
۲۰۔ایضاً	ماہنامہ '(کتاب نما)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۹۴ء	
۲۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً	

۲۲۔ایضاً	میرا کالم	روزنامہ سیاست، حیدرآباد ۲۷؍جون ۱۹۹۹ء			
۲۳۔ایضاً	ایضاً	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد جون ۱۹۹۹ء			۱۵
۲۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶۸
۲۵۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۷۰
۲۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶۵۔۶۶
۲۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶۲۔۶۳
۲۸۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۸۳

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین: تنقیدی جائزہ

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اردو کے اُدباء نے مغربی زبانوں میں سب زیادہ اکتساب انگریزی سے کیا اور اس طرح انگریزی زبان اور علم و ادب کے اثرات ہمارے ادیبوں کے یہاں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں اور اسی کے اثر سے اُردو میں بھی طنز و مزاح کا فروغ سب سے پہلے شاعری کے میدان میں ہوا۔ اگر ہم انگریزی ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ انگریزی ادب میں طنز نگاری میں اگر کسی کو فوقیت حاصل ہے تو وہ چاسر ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر وزیر آغا چاسر کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انگریزی ادب میں طنزیات و مضحکات کا آغاز چاسر سے ہوا۔ چاسر کے اشعار میں بلند قہقہوں کے پہلو بہ پہلو لطیف رمز کے بھی خاصے اچھے نمونے ملے ہیں۔ وہ ہم پر بھی ہنستے ہیں اور خود پر بھی اور بہ حیثیت مجموعی زندگی کی طرف اس کا ردعمل ہمدردانہ ہے''۔[1]

چاسر کے بعد انگریزی ادب میں دوسرا نام شیکسپیئر کا ملتا ہے جسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جس نے اپنے زمانے کی معاشرتی زندگی کی مختلف جہات پر طنزیہ اور مزاحیہ ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ اس نے تلخ سچائیوں کا اظہار مزاحیہ اور طنزیہ اسلوب میں کیا ہے۔ اس کے تخلیقی کرداروں میں میکبیتھ، اوتھیلو، ڈیسڈ یمونیا اور روزالین وغیرہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شیکسپیئر کا عہد انگریزی ادب کے عروج کا زمانہ ہے کیوں کہ اسی عہد میں بٹلر اور ڈرائڈن پوپ نے طنز و مزاح کی ادبی روایتوں کو منزل عروج تک پہنچایا۔ اگر ہم اٹھارہویں صدی عیسوی کے

انگریزی ادب کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس وقت تخلیق ہو رہے ادب میں طنز و مزاح کا پہلو بہت زیادہ ہے۔ شعراء میں اگر پوپ نظر آئیں گے تو نثر میں سوئفٹ کا نام بہت واضح نظر آئے گا۔ ناول میں اگر فیلڈنگ پر جاکر نظر ٹھہرے گی تو فن ڈرامہ میں گولڈ اسمتھ۔ ۱۸ویں صدی عیسوی کے اواخر میں جین آسٹن جاسلنٹ نے ظریفانہ اور طنزیہ روایت کو منزل عروج تک پہنچایا۔ ۱۹ویں کے اوائل میں ڈکینس نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اسے غیر معمولی وسعت عطا کی۔ چارلس ڈکینس نے بلا مبالغہ اپنی تخلیقی قوت کے ذریعہ اپنے زمانے کے اس معاشرے کے نت نئے گوشوں کو نہایت ہمدردی کے ساتھ اجاگر کیا۔ ڈکینس کے بعد تھیکرے نے طنزیات و مضحکات کی روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈکینس کے بعد پیکاک سب سے اہم مزاح نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ پیکاک کے ہم عصر شعرا میں اسکوائر، سوٹن، اسٹیفن وغیرہ کا نام بہت ہی مشہور و معروف ہے۔ اس کے بعد عہد وکٹوریہ میں لوئس کارویل، ایڈورڈ لیئر اور گلبرٹ نے مزاح کو قہقہوں کی وادی میں پہنچا دیا۔ یہ وہی تخلیق کار ہیں جن کے زیر سایہ ۱۹ ویں صدی عیسوی کے وسط میں ہمارے اُردو ادب میں طنز و مزاح در آیا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں طنز و مزاح کا پہلا دور کمزور ہے حالاں کہ اردو کے اولین مزاح نگاروں میں سودا، مصحفی، انشاء، رنگین، چرکین، جعفر زٹلی اور افق وغیرہ کے اسمائے گرامی اہمیت کے حامل ہیں۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ مذکورہ مزاح نگاروں میں ہمیں صحت مند رویہ دیکھنے کو نہیں ملتا بلکہ ان کے یہاں ابتذال اور فحش نگاری اور تنگ نظری حد سے تجاوز کر گئی ہے لیکن سودا ایک ایسے شاعر تھے جن کو صحیح معنوں میں مزاح نگار کہا جاسکتا ہے اور ثبوت کے طور پر ان کی مشہور ہجوِ اسپ موسوم بہ 'تضحیک روزگار' پیش کی جاسکتی ہے۔ ان کے علاوہ اردو کے جملہ شعراء کے یہاں گالی گلوچ اور ایک دوسرے پر حد سے زیادہ چھینٹا کشی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اگر اودھ پنچ سے ٹھیک پہلے کے ادب پر نظر ڈالیں تو ہمیں نظیر اکبرآبادی کے کلام میں طنز و مزاح کے نمونے جابجا بکھرے پڑے ملیں گے۔ اسی طرح غالب کے یہاں ہمیں ان کے خطوط میں طنز و ظرافت کے اعلا نمونے نظر آئیں گے جس کی بناء پر پروفیسر آل احمد سرور نے انہیں اردو ادب کا ایڈیسن قرار دیا ہے۔

متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت تقریباً ڈیڑھ سو سال قدیم ہے لیکن نثر میں باضابطہ طور پر انیسویں صدی کے اواخر ہی سے اسے شعوری طور پر برتا گیا۔ اس ضمن میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار اودھ پنچ کو اولیت حاصل ہے

جس میں منشی سجاد حسین اوران کے ہم نواؤں پنڈت رتن ناتھ سرشار، جوالا پرساد برق، مچھو بیگ ستم ظریف وغیرہ نے اپنی مزاحیہ تحریروں سے اس صنف کو کافی مقبولیت بخشی اور اسے پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ نیز زمانے کی بدلتے اقدار، حالات کی کشمکش، سیاسی، سماجی و معاشی صورت حال اور ان سے پیدا شدہ پیچیدگیوں نے بھی اس قسم کے موضوع اور مواد عطا کیے جس سے اس صنف کا دامن اتنا وسیع ہو گیا کہ اسے نثری ادب میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔

درحقیقت طنزیہ و مزاحیہ ادب ایک ایسا ادب تسلیم کیا جاتا ہے جس میں مقصدیت اور افادیت دونوں ہی پائی جاتی ہیں یعنی اس قسم کے ادب میں ایسا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جو اپنے اندر دلکشی تو رکھتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ قوم و افراد کے افکار و تصورات، رُجحانات و خیالات کو بھی پیش کرتا ہے اور اس کے ذریعہ طرزِ معاشرت، رسم و رواج، سیاسی، اقتصادی و سماجی معاملات پر بہ خوبی روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اس صنف کو پروان چڑھانے میں شاعروں اور نثر نگاروں دونوں ہی نے کافی اہم رول ادا کیا۔ خصوصاً نثر کے میدان میں اودھ پنچ کے قلم کاروں سے لے کر رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، ابن انشاء، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، فرقت کاکوروی، انجم مان پوری، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، رشید قریشی، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، فیاض احمد فیضی وغیرہ سبھی نئے پرانے قلم کاروں نے اپنی تخلیقات سے نہ صرف اس صنف کو مالا مال کر دیا ہے بلکہ طنز و مزاح نگاری کے فروغ کو ہی اپنا اولین مقصد گردانا ہے۔

برصغیر ہندو پاک کے تمام مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین کا نام نہایت ہی ادب و احترام سے لیا جاتا ہے جن کی تحریریں شگفتہ، چلبلی اور قہقہہ بہ دوش ہوا کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے سیکڑوں مزاحیہ مضامین اور خاکوں کے ذریعہ فکاہی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ لطیف مزاح، شائستگی، شرافت، نیکی، اعتدال پسندی، زبان کا رچاؤ، تیکھے اور دلکش اسلوب نے انہیں ان کے تمام ہم عصروں میں ممتاز و منفرد بنا دیا ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا مضمون ''ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' ۱۹۶۴ء میں لکھا اور اس وقت سے لے کر آج تک ان کا فن روز افزوں ترقی کے منازل طے کرتا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ان کے پہلے مضمون کا ایک اقتباس جس سے ان کے فن کی بلندی کا اندازہ ہو سکے گا۔

''ایک بار کا ذکر ہے کہ وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے اور مالک مکان کی زیادتیوں کا دُکھڑا رو رہے تھے کہ یکبارگی انہوں نے مکان کے در و دیوار کی جانب نظر دوڑائی۔ ایک آہ سرد کھینچی اور نہایت ہی درد بھرے لہجے میں غالبؔ کا شعر یوں پڑھا

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ مرزا غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اس پر ہم نے کہا قبلہ! اب تو آپ کی جرأت اتنی بڑھ گئی کہ در و دیوار پر بھی مرزا غالبؔ کو اُگانے لگے ہیں۔ خدا کے لیے شعر میں مرزا غالبؔ کی جگہ سبزہ غالب کہیے۔ بولے!'' آپ مجھے بہکانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ غالب کا پورا نام سبزہ غالبؔ نہیں بلکہ مرزا غالبؔ تھا''[۲]

یہ حقیقت ہے کہ رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری انشاء پردازی کے قبلہ و کعبہ ہیں جن کی طرف راغب ہوئے بغیر طنز و مزاح کے سلسلہ میں کیا گیا تمام وِرد بے کار ہے' ساتھ ہی اس امر سے انحراف بھی ممکن نہیں کہ مجتبیٰ حسین موجودہ انشائیہ نگاری کے امام ہیں' جن کی امامت میں ہندوستانی فن مزاح نگاری نے نقش و نگار حاصل کیے ہیں۔ مجتبیٰ حسین موجودہ انشائیہ نگاری کا وہ اہم نام ہے جن کی تحریریں پڑھتے وقت قاری رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی چاشنی اور پطرس کے طنز دونوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ کبھی ان کا اندازِ تخاطب فرحت اللہ بیگ اور ابن انشا کا رنگ لئے ہوتا ہے تو کبھی ان کا پیرایہ بیان' احمد جمال پاشا اور مشتاق یوسفی سے جاملتا ہے یعنی طنز و مزاحیہ ادب کے تمام بڑے فن کاروں کی خوبیاں ان کے مضامین میں یک جا ہوگئی ہیں۔

اس سے قبل کہ مجتبیٰ حسین کے مضامین کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے۔ یہ جان لینا ناگزیر ہے کہ طنز کیا چیز ہے' مزاح کیا ہے؟۔ دنیائے ادب میں طنز و ظرافت کی اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کا محرک ایک بلند اور شریفانہ احساس ہوا کرتا ہے ورنہ طنز' تضحیک اور گالی گلوچ کے زمرے میں آجائے۔ Encylopaedia Britanica کے حوالے سے رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ادبی نقطۂ نظر سے طنز ادب اور زندگی کے مضحک' قابل گرفت اور تنفر انگیز پہلوؤں پر معاندانہ و مخالفانہ اور تحریفانہ تنقید کا درجہ رکھتا ہے۔ رچرڈ کے نزدیک ادبی طنز کے لیے مزاح بھی ضروری ہے اور کوئی ادبی فارم بھی کیوں کہ طنز اگر مزاح سے بے گانہ ہو تو

محض دُشنام طرازی بن کر رہ جائے گا اور اگر کسی ادبی فارم کا پابند نہ ہوا تو بھی محض مسخرے پن اور سستی فقرہ بازی کا رنگ لے لے گا۔ چوں کہ طنز ادب کی صنف نہ ہو کر صفت کا درجہ رکھتا ہے، اس لیے اُردو نظم و نثر کی کسی بھی صفت میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔

''ہجو یا ہجا (طنزیات کے مفہوم میں) کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ہنگم یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالات پر ہمارے جذبہ تفریحات کو تحریک ہو بشرطیکہ اس ہجو (طنز) میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو، اگر ان چیزوں کا فقدان ہو تو پھر یہ گالی گلوچ یا دہقانیوں کی طرح منہ چڑانا ہوگا''۔[۳]

بہ قول تھیکرے ایک طنز نگار حتی الوسع زندگی کے ہر شعبے پر ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور مکر و فریب، رعونت و منافقت، حق و باطل کے خلاف اس طرح جہاد کرتا ہے کہ بالآخر ہمارے جذبات مرحمت و محبت یا نفرت و حقارت کو تحریک ہوتی اور ہم ان جذبات کو برسرپیکار لانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور مظلوم و ناتواں کے لیے شفقت و محبت محسوس کرنے لگتے ہیں اور ظالم و جابر کو قابلِ نفریں و ملامت قرار دیتے ہیں۔ تعصّب، خود بینی، غرور، نمود و تصنّع، ذہنی سطحیت، ریا کاری (دینی و اخلاقی، سیاسی، معاشرتی وغیرہ) طنز نگار کے عام ہدف ہوا کرتے ہیں اور وہ انہیں موضوعات کو اپنے مشاہدے سے پرکھ کر طنزیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ طنز کی تحریک شدید نفرت سے ہوتی ہے۔ وہ نفرت مندرجہ بالا عوامل سے ہو سکتی ہے یا پھر کسی شخص سے، کسی ادارے سے یا پھر کسی عہدے سے فیلڈنگ نے جوزف اینڈریو کے دیباچے میں لکھا:

''شدید برائیاں ہماری شدید نفرت کی مستوجب ہیں۔ چھوٹی موٹی فروگزاشتوں کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ ان کا مضحکہ نمود و تصنّع ہی ہے۔ بدصورتی، افلاس اور کمزوری بجائے خود مضحکہ خیز چیزیں نہیں۔ وہ اپنے اصل کردار سے منحرف ہو کر نمود و تصنّع کا شکار ہو جاتی ہیں''۔[۴]

اگرچہ طنز نگار غیر جانب دار نہیں رہ سکتا کیوں کہ طنز اخلاقی ہو یا سیاسی یا پھر سماجی و معاشرتی، اس کی بنیاد کسی نہ کسی طرح طنز نگار کی ذاتی ناپسندیدگی پر ہی ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس ادبی تخلیق کی بنیاد ناپسندیدگی پر ہوگی، وہ ہمیں نفرت کی جانب ہی گامزن کرے گی۔ اس میں یہ صلاحیت ہرگز نہ ہوگی کہ وہ ہمارے صالح جذبات و احساسات کو مہمیز کرے،

متاثر کرے۔ شاید اسی لیے نارمن فرلانگ نے *English satire* کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''طنز گار کو بالعموم ایک اُجڈ اور کینہ پرور ادیب سمجھا جاتا ہے''۔ ۵

یوں بھی اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ طنز نگار کا کوئی مربوط فلسفۂ زندگی نہیں ہوتا۔ اس کی نظر میں انسانی زندگی کے وہ پہلو نہیں ہوتے جن سے ہم میں زندہ رہنے کی تحریک ملتی ہے' اُمنگ' جوش اور جد و جہد کا حوصلہ ہوتا ہے کیوں کہ اس کی نظر ہمیشہ منفی اور تاریک پہلوؤں پر ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ منفی قدروں کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ سکّے کا ایک رُخ ہی دیکھتا ہے جو کہ مسخ شدہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے پیمانوں سے زندگی کی نئی قدروں کا تجسّس ہرگز نہیں پیدا ہوسکتا۔ ہاں اگر اس جذبۂ نفرت میں جذبۂ اصلاح کارفرما ہے تو یہ لائق صد احترام بھی ہے اور عمدہ ادب تصور کئے جانے کے قابل بھی۔ مثلاً اگر کوئی طنز نگار ایسے سماج سے نفرت کرتا ہے' جس کی بنیاد ظلم وزیادتی یا انصاف پر ہو' تو یہ اس کی راست بازی اور بلند اخلاقی کی دلیل ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے' احساس نہ دلائے تو سماج سے اچھے بُرے' حرام وحلال کی تمیز ختم ہوجائے۔ اس قسم کی نفرت سے پیدا ہونے والا طنز ادب میں کیا مقام حاصل کرے گا' کہا نہیں جاسکتا۔ لیکن اعلا طنز ضرور قرار دیا جاسکتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اعلا اور ادنیٰ طنز کی حد بندی بھی یہیں ہوتی ہے۔ اگرچہ طنز نگار غیر جانب دار نہیں رہ سکتا تاہم جذبات کی رو میں بہہ نکلنا طنز کی موت ہے۔ اس لیے جذبات پر عقل کی بالادستی قائم رہے' تعصّب سے دور رہنے کی کوشش کی جائے' معنی خیز اور متوازن مزاح کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے' بدتمیزی' بغض وعناد اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ نہ کیا جائے' ساتھ ہی طنز نگار اپنی کوتاہ اندیشی' علمی کم مائیگی یا قدامت پرستی کا مضحکہ خود اُڑاتا ہے' کھوکھلے معاشرے کو بے نقاب کرتا ہے۔ سماج کے ان عیوب کی پردہ دری کرتا ہے جن پر صاحبِ اقتدار لوگوں نے مکر وفریب کے پردے ڈال رکھے ہیں تب جاکر عمدہ طنز تخلیق پاتا ہے اور ایسے طنز نگار کو بڑا طنز نگار کہہ سکتے ہیں اور اس کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب کو اعلا طنز یہ ادب کے زُمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

Insight and outlook کے مصنف آرتھر کوسلر نے اپنی تصنیف میں طنز کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ طنز جانی بوجھی چیزوں کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرنے کا نام ہے جب کہ سوئفٹ کے نزدیک طنز ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سوائے اپنے سب کی

کمزوریاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یعنی طنز نگار ایک عیب جو ہے جب کہ ہمارے معاشرے میں عیب جوئی کو اخلاقاً برا تصور کیا جاتا ہے اور یہی ہمارا عقیدہ بھی ہے کہ جو دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے، خدا اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

Dictionary of Literary terms میں طنز (Satire) کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں:

The rediculing of folly. stupidity ,of vice,the use of irony, Sarcasm of ridicule for exposing of denouncing the fraulities and faults of mankind, satire is a literary manner, or technique that blends humour and wit with a critical attitude towards human activities and institution "۶

طنز کی مذکورہ بالا تعریفوں سے تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ اس کا لازمی عنصر مزاح ہوتا ہے جس کے بغیر یہ گالی گلوچ، دشنام طرازی کے زمرے میں آجائے گا، دوم یہ کہ اس میں ادبیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے جس کے لیے فن کار کو زبان و بیان پر مہارت حاصل ہونی چاہئے اور تیسری بات یہ کہ طنز کا محرک جذبہ اصلاح ہوتا ہے جو طنز و مزاح نگار کو بے ہنگم اور مضحکہ خیز واقعات پر طنز و ملامت کے لیے اُکساتا ہے۔

انسان ہی تنہا ایسا جانور ہے جس میں ہنسنے کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے حیوان ظریف کہا گیا۔ گویا ظرافت ہی وہ خوبی قرار پائی جس نے انسان کو انسان بنائے رکھا۔ اس نکتہ کو مزید واضح کرتے ہوئے Enjoyment of laughter کے مصنف East Man نے مزاح کو بھی ایک انسانی جبلت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''مزاح کھیل کی جبلت (Play Insight) ہے اور اس کا بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو صدمے یا مایوسی کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنے کی ترغیب دے''۔ ۷

اسٹیفن لیکاک (Stephen Lecok) نے مزاح کی تعریف کرتے ہوئے Humour and Humanity میں لکھا ہے کہ:

''مزاح زندگی کی اس ناہمواری اور شعور کا نام ہے جس کا فن کارانہ اظہار ہو جائے''۔[8]

اسی طرح کیفیہ میں دتا تریہ موہن کیفی نے لکھا ہے کہ:

''جب ظرافت میں صرف خوش طبعی ہو تو وہ مزاح ہے''۔[9]

مزاح کی ان تعریفوں کی مزید واضح کرتے ہوئے ٹیلر (Taylor) نے کچھ اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے:

''مزاح زندگی کے بارے میں وہ رجحان ہے جو زندگی کی خامیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لے کر ان کو ہنسی اور کسی حد تک ہمدردی کے ساتھ واضح کرتا ہے''۔[10]

Dictionary of litrary terms میں Harry Shaw نے مزاح کی تفصیل اس طرح درج کی ہے:

" A Comic quality causing amusement humor is also applied to the facultieof seeing, understading of expressing what is amusnig and laughter producing and to a mood of frame of mind ("in a good humor today). Humor consist of primarily of the recognition and expression of peculiarities, oddities and absurdities in a situation of action"[11]

مزاح کی مندرجہ بالا تعریفوں سے تین باتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ مزاح نگار اپنے عمیق مشاہدے سے زندگی کی ان تمام ناہمواریوں اور مضحک پہلوؤں کو اپنے قلم کی زد میں لاتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ دوسرے ان ناہمواریوں اور مضحک پہلوؤں کی طرف مزاح نگار کے ردِعمل میں کوئی استہزائی کیفیت نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ اس سے محظوظ ہوتا ہے اور ان حالات کے تئیں ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔ تیسرے یہ کہ مزاح نگار اپنے مشاہدے اور تجربے کے اظہار میں ایسا فن کارانہ اندازِ بیان اختیار کرتا ہے جس سے

انسان کو اس کے صدموں، مایوسیوں اور محرومیوں سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دی جا سکے۔

ابھی تک ہم نے طنز و مزاح سے متعلق مختلف مغربی ناقدین کی آراء پیش کرنے کی کوشش کی۔ اب چند ہندوستانی ناقدین کی رائے جاننے کی کوشش کریں گے کہ ان کے یہاں طنز و مزاح سے کیا مراد ہے۔ ممتاز ترقی پسند ناقد پروفیسر احتشام حسین طنز کے لیے مزاح کو ضروری گردانتے ہیں لیکن ان کے خیال میں مزاح کے لیے طنز ضروری نہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''تنقید اور عملی تنقید'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''طنز اور مزاح نہ صرف انسانی نفسیات کا جزو ہیں بلکہ ان کے ذریعے قوم اور افراد کی رہبری بھی ہوتی ہے۔ طنز نگار سے زیادہ کسی میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی حکومت اور اپنی قوم کا مذاق اُڑا سکے۔ طنز میں ناگواری کی جو کیفیت ملتی ہے، شاید اسی وجہ سے بہت سے لوگ اسے مزاح سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ چناں چہ ٹھیکرے، میریڈتھ دونوں نے مزاح کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طنز کا وجود مزاح کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہاں مزاح سے طنز بالکل پاک بھی ہو سکتا ہے''۔[12]

مزاح کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ عداوتوں اور نفرتوں میں اضافہ ہو بلکہ اسے تو حیاتِ انسانی کے روحانی اور اخلاقی مقاصد کو فروغ دینے میں معاون ہونا چاہئے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے ہم سماج میں موجود ان خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں جس کا عام لوگوں کو احساس نہیں ہوتا اور جو نہایت تلخ ہوتی ہیں اور ایک فن کار کے ذریعے ان خامیوں کو تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن وہ اسی خامی کو طنز و مزاح کے پیرائے میں اس قدر خوب صورتی سے سامنے لے آتا ہے کہ قاری بہ خوشی ان کمزوریوں اور خامیوں کی اصلاح کر سکے۔ کسی شخص کا کسی سبب کے بغیر ہنسنا کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن انسان ہنسی کے ذریعہ انسانی تلخیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس میں طنز کی آمیزش ہو تو یہ ہنسی اصلاح کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک طنز و مزاح نگار اپنے نگارشات میں یہی موقف اختیار کرتا ہے اور اسی پر کاربند رہنا چاہتا ہے۔ اسی لیے کلیم الدین احمد نے بھی ہنسی کو اعضائے انسانی کے لیے ضروری خیال کرتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے:

''یہ بات مسلم ہے کہ ہم ہنستے ہیں جیسے ہم غصہ کرتے ہیں نفرت یا محبت کرتے ہیں، جاگتے یا سوتے ہیں اور ہنسی ہماری صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہنسی کا مادہ انسان سے سلب کرلیا جائے، اگر وہ اسباب نیست و نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہم ہنستے ہیں تو پھر ممکن ہے وہ فرشتہ ہو جائے۔ وہ انسان باقی نہیں رہے گا۔ غالباً فرشتے ہنستے نہیں اور نہ ہنسی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ہر شئے مکمل، موزوں و متناسب ہو، وہاں ہنسی کا گزر نہیں ہوسکتا۔ ہنسی عموماً عدمِ تکمیل ' بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے''۔[۱۳]

یہ سچ ہے کہ طنز و مزاح جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک معنیٰ خیز فضا بن جاتی ہے۔ طنز و مزاح کے وسیلے سے اظہار کا جو اسلوب سامنے آتا ہے، اس کی افادیت و معنویت کو محمد علی صدیقی یوں پیش کرتے ہیں:

''طنز و مزاح ایک نوع کی چارہ گری ہے۔ اس میں بے ڈھنگی اور بے سروپا باتوں اور کیفیات پر قرینہ سے براہ راست وار کیا جاسکتا ہے اور زیر لب تبسم یا خندۂ بے اختیار کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔ ہر سہ صورتوں میں مضحک پر گریہ کرنے کا رواج عام نہ ہوسکنے کی بڑی معقول وجوہات رہی ہوں گی لیکن اصلاح احوال کے لیے سنجیدہ رشتوں کے طنز و مزاح کے ہتھیار اس قدر تیز اور ملائم سمجھے گئے اور بدستور سمجھے جا رہے ہیں کہ تیر ٹھکانے پر لگتا ہے اور گھائل کو آداب عرض کرتے بنتی ہے۔ ایک مسکراہٹ کے ساتھ جس میں فی الفور تفہیم کے ساتھ خودکار تنبیہ کا مقصد بھی پورا ہوا جاتا ہے۔[۱۴]

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک تو طنز اور ظرافت دونوں ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ چناں چہ انہوں نے لکھا ہے:

''بعض لوگوں کے نزدیک طنز کو اپنی افادیت کے باعث مزاح پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں مزاح ایک قومی کارنامہ ہے وہاں طنز ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ مزاح برائے مزاح کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کی دانست میں طنز ہی ادب میں مستقل اقدار کا حامل ہے لیکن درحقیقت یہ نظریہ محض غلط فہمی پر مبنی

ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتا ہے۔لیکن دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی، پھیکی اور بدمزہ زندگیوں کو منور کرتا ہے اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔فی الواقع افادیت کے نقطہ نظر سے دونوں ہمارے رفیق وغم گسار ہیں اور ہم ایک دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر ہیں۔''۱۵

اس صداقت سے شاید ہی کوئی انکار کرسکتا ہے کہ معاشرے کی ناہمواری ہی ایک فن کار کو طنز و مزاح کی جانب مائل کرتی ہے اور اس طرح طنز و مزاح کا فروغ ہوتا رہتا ہے لیکن اس ناہمواری کو منظر عام پر لانے کے لیے ایک مزاح نگار کا نظام معاشرہ سے باخبر رہنا ضروری ہے۔اسی لیے پروفیسر انجم اعظمی کا کہنا ہے کہ:

''ہنسنے ہنسانے کے سلیقے سے دو سطحیں سامنے آتی ہیں جب اپنے لوگوں اور معاشرے سے بغل گیری مقصود ہو تو وہاں صرف ظرافت ہوتی ہے لیکن جب معاشرہ بہت ناہموار ہو منفی اور مثبت ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو نئے اور پرانے میں شدید تصادم ہو جس میں ہنس بول کے ملاپ نہ ہو سکے اور انسان خود اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں مسلسل ٹکراؤ سے دوچار ہو تو طنز کا کاری ضربیں لگا کر وہ دوبارہ ایک ہموار اور غیر متصادم اکائی کی طرف بڑھتا ہے۔طنز و ظرافت یہاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اثر پیدا کرتے ہیں۔کبھی کبھی طنز ظرافت کے بغیر بھی ہوتا ہے۔ایسا وار اسی وقت کامیاب ہوتا ہے کہ طنز کا ہتھیار اعلا سنجیدگی کے ہاتھ میں ہو اور اعلا سنجیدگی کا تقاضا ہے کہ زندگی کے سناٹے سے دوچار ہو تو وہیں ٹھہر نہ جائے۔اس سے نکلنے کا بھی راستہ اسے تلاش کرنا ہوگا۔اس لیے وہ پھر کسی بہت بڑے عمل یا ہنسنے کے سلیقے سے دوچار ہو جائے گی۔اس لیے عموماً طنز و ظرافت ایک دوسرے کے ساتھ ملیں گے''۔۱۶

طنز و مزاح کی روایت کو فروغ دینے میں اودھ پنچ کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''اودھ پنچ سے پہلے کی اُردو شاعری میں زاہد سے چھیڑ چھاڑ کی متذکرہ نفسیاتی وجہ کے علاوہ اپنے زمانے کی سماجی بدنظمی، قنوطیت اور ماحول کے نت نئے قواعد و ضوابط کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر بھی نمودار

ہوئی۔ دراصل اس طویل زمانے میں جمہوریت کے تصور کی عدم موجودگی اور قومی کردار کی بددلی و ناکردگی کے باعث ملک کے ایک طبقے نے سیاسی وسماجی مسائل پر براہ راست نکتہ چینی کے بجائے مقاومت کمترین کا راستہ اختیار کیا اور اپنے جذبات کے تند و تیز بہاؤ کو اس حد تک زاہد اور محتسب کی طرف بھی موڑ دیا۔ ١٧

طنز ومزاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''طنز و مزاح کا تعلق معاشرت کے مسائل سے ہے۔ جب تک انسان کا شعور اتنا بالغ نہ ہو کہ وہ نہ صرف گرد و پیش کی بے ہنگم باتوں پر ہنس سکے بلکہ خود اپنا خاکہ بھی اڑا سکے۔ اس وقت تک وہ طنز و مزاح کی روح کو نہیں سمجھ سکتا۔ طنز و مزاح بے معنیٰ ہنسی کا نام نہیں ہے۔ یہ گہرے عرفانِ ذات یا معاشرے کے شعور سے پیدا ہوتا ہے''۔ ١٨

آل احمد سرور نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تنقید کیا ہے'' میں طنز و ظرافت کے فرق کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

''اعلیٰ طنز میں ظرافت اور ادبی حُسن دونوں ضروری ہیں۔ خالص ظرافت نشیب و فراز کا احساس دلا کر ایک مسرت و انبساط پیدا کرتی ہے۔ طنز میں مسرت اور خوشی ملی جلی ہوتی ہے''۔ ١٩

طنز ومزاح کی مندرجہ بالا تعریفوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ طنز نفرت سے اور مزاح محبت سے جنم لیتا ہے۔ طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں نشتریت کا عنصر غالب رہتا ہے یعنی طنز نگار جس شئے کو ہدف بنا کر ہنستا ہے' اس کے در پردہ ایک قسم کی نفرت' ناگواری اور بغاوت کارفرما ہوتی ہے جو اسے تبدیل کر دینے کی خواہاں نظر آتی ہے۔ اس کے علی الرغم مزاح زندگی اور ماحول سے اُنسیت' ہمدردی اور مفاہمت کی پیداوار ہے نہ کہ کسی استہزائی کیفیت کی کیوں کہ مزاح نگار جن اشیاء اور حالات و واقعات پر ہنستا ہے' اس سے محبت بھی کرتا ہے اور اسے گلے لگا لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ طنز نگار توڑتا ہے اور توڑنے کے اس عمل کے دوران وہ ایک قسم کے جذبہ افتخار سے سرشار ہو کر فاتحانہ قہقہے لگاتا نظر آتا ہے جب کہ مزاح نگار اپنی تخلیقات کے ذریعے ان ٹوٹے اور بکھرے ہوئے شیرازوں کو نہایت ہی سلیقے سے

جوڑنے اور سنوارنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ طنز میں بے دردی ہوتی ہے تو مزاح میں ہمدردی۔ یہی وجہ ہے کہ جسے مزاح کا ہدف بنایا جاتا ہے وہ بھی ہنسی میں شریک ہوسکتا ہے مگر وہ شئے یا شخص جو طنز کا ہدف بنتا ہے' کبھی بھی ہنسنے والوں کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتا۔

طنز میں زہرناکی' نشتریت' کاٹ' طعن وتشنیع' بغض وعناد' تضحیک اور بعض اوقات جھلاّ ہٹ اور چڑچڑا پن نمودار ہوجاتا ہے جب کہ مزاح ان سب سے مبرا ہوتا ہے اور صرف اپنی خوش طبعی کے سہارے زندہ رہتا ہے۔خالص مزاح کو طنز کی ضرورت نہیں لیکن طنز بہرحال مزاح کا محتاج ہوتا ہے کیوں کہ اگر طنز مزاح سے بے گانہ ہوجائے تو محض جھلاّ ہٹ یا دُشنام طرازی کا تاثر دینے لگے گا۔طنز لازماً کسی اصلاحی مقصد کے تحت تخلیق کیا جاتا ہے جب کہ مزاح کا مقصد محض مسرت آفرینی بھی ہوسکتا ہے۔بلکہ خالص مزاح تخلیق کرنے والے فن کار کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ ہمیں مسرت بہم پہنچائے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ ان ناہمواریوں اور مضحک پہلوؤں سے ہمیں بڑے لچسپ انداز میں روشناس کراتا ہے جو اس نے اپنے ماحول اور دوسروں کی زندگی سے نفرت کرنے کے لیے بڑی حقارت اور دکھ کے ساتھ چنی ہیں۔میں نے اس باب میں مجتبیٰ حسین کے مضامین کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین کہا ہے۔اس کی خالص وجہ یہی ہے کہ ان کے تقریباً سبھی مزاحیہ مضامین میں طنز کی نشتریت بھی پائی جاتی ہے لیکن وہ دور کھڑے ہوکر قہقہے لگاتے نظر نہیں آتے بلکہ ایک حساس فن کار کی طرح ان خامیوں کی جانب اشارہ کرتے جاتے ہیں جس میں جذبہ اصلاح' ادبی حسن اور ظرافت سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین ایسے فن کار ہیں جنہوں نے بچپن ہی سے زندگی اور اسکی ناہمواریوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اور آج تک وہ اسے عام آدمی کی طرح برتتے چلے آرہے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام ترش و تلخ تجربات سے آشنا ہیں جس کا اظہار بھی وہ اپنی تحریروں میں جابجا کرتے ہیں۔وہ خود لکھتے ہیں:

> "بعض لوگ مزاح کی کیفیت کو بہت معمولی کیفیت سمجھتے ہیں۔حالاں کہ سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچے غموں کے بعد شروع ہوتی ہیں۔زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب

کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہے کی طرف جست لگاتا ہے' وہی سچا اور باشعور
قہقہہ لگا سکتا ہے''۔[20]

موصوف اپنی اس بات کو مزید واضح کرتے ہوئے ''تکلف برطرف'' میں رقم طراز ہیں

''ہنسی کو ایک مقدس فریضہ جانتا ہوں اور قہقہہ لگانے کو دنیا کا سب
سے بڑا ایڈوینچر' زندگی کے بے پناہ غموں میں گھرے رہنے کے باوجود
انسان کا قہقہہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے وسیع سمندر میں بھٹکتے ہوئے ایک جہاز کو
اچانک کوئی جزیرہ مل جائے''۔[21]

ہم سبھی جانتے ہیں کہ ضحک خاصہ انسانی ہے جو اشرف المخلوقات یعنی انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے منفرد و ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ شاید اسی لیے اسے حیوانِ ناطق کے علاوہ حیوانِ ظریف کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ یقیناً انسان ابتدائے آفرینش سے ہی ہنسنے کا سلیقہ سیکھ گیا تھا' خواہ وہ آج کا تمدن یافتہ دور ہو یا پھر قدیم غیر متمدن دور دونوں ہی ادوار میں ہنسی انسان کے زندہ رہنے اور اسے اس کے رنج وغم سے نجات دلانے میں ممد و معاون رہا ہے۔ اب یہ مزاح نگار کے فن پر منحصر کرتا ہے کہ وہ ہنسی کو کس طور پر برتتا ہے۔ سماج کے عیوب سے پردہ اٹھانے کے لیے' ان پر طنز کرنے کے لیے یا پھر کسی اور مقصد کے لیے۔ مجتبیٰ حسین کا فن اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ ابتداً قاری کو خوب ہنساتے ہیں اور پھر ایک ماہر سرجن کی طرح طنز کے نشتر سے سماج کی ان خامیوں کو کُریدتے ہیں جو گریہ وزاری اور اصلاح کا سبب بن سکتی ہیں۔ پیش ہے ایک اقتباس جس میں انہوں نے کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''سچ پوچھئے تو موجودہ حالات میں ہنسنا بڑے دل گُردے کا کام
ہے۔ جب بھی میں دنیا کے کسی حصے میں قتل و غارت گری کی خبریں پڑھتا
ہوں' نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر سُنتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے
صدیوں کا ذہنی سفر طے کرنے کے باوجود انسان ابھی تک ہنسنے کا اہل نہیں
بن سکا۔ اگر وہ ہنستا بھی ہے تو اس کی ہنسی بڑی پُر آشوب ہے' بڑی بھیانک
ہے' مجھے اس ہنسی سے بڑا خوف ہوتا ہے' جس کے پیچھے درندگی چھپی بیٹھی ہو'
وہ ہنسی جو بعد میں ہنسنے والے کو شرمسار کرے' انسان پر ایک تہمت کا درجہ

رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی مزاحیہ مضمون لکھ لیتا ہوں تو مجھے
یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر خلا کی وسعت کچھ اور پھیل گئی ہے۔ آج
کے انسان کی ہنسی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی ہنسی کبھی کبھی آنسو بن کر ٹپک جاتی
ہے' نہ جانے ہر قہقہے کے پیچھے مجھے تلخیوں' ناآسودگیوں اور محرومیوں کے آنسو
کیوں نظر آتے ہیں''۔[۲۲]

گزشتہ تحریر کی روشنی میں ''یہ رکشہ والے'' کے چند جملے دیکھیں جس میں اس کے مرکزی
کردار کے اندر پائے جانے والے شدید کرب' مایوسی اور محرومی کا ذکر ہے جس میں وہ اس
طرح کے جملے کہتا ہے۔ ''رکشہ خون سے چلتا ہے' خون سے' اس جملے سے نہ صرف اس
مخصوص طبقے کی زندگی کا مکمل نقشہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے بلکہ یہ جُملے کسی بھی حساس
انسان کو خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہیں بلکہ ذہن وضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے بھی:

''ایک بار کسی صاحب نے رکشہ والے سے کرایہ پوچھا تو رکشہ والا
نے آٹھ آنہ بتادیا۔ وہ صاحب کہنے لگے بس کا کرایہ تو صرف دس پیسے
ہوتا ہے' اس پر رکشہ والا جواب دیتا ہے:

''جی! دس پیسے ہوتا ہے مگر آپ نے غور نہیں فرمایا کہ بس پٹرول سے
چلتی ہے' رکشہ خون سے چلتا ہے' خون سے''۔[۲۳]

مندرجہ بالا عبارت سے موصوف کے اندر ایک حساس فنکار کی تخلیقی اضطرابیت بہ خوبی
نمایاں ہے اور وہ اس امر کی جانب اشارہ کرنے میں بھی کامیاب ہیں کہ ان کے یہاں خندہ
آوری کا ایک ایسا تصور پایا جاتا ہے جو آنسوؤں کی تراوش سے پروان چڑھتا ہے اور جس کے
درپردہ تمام بنی نوع انساں کے المیوں اور محرومیوں کا اندوہ ناک احساس بھی موجزن ہے۔
یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین پڑھتے وقت' ہمیں سماج کے مجبور ومحکوم انسانوں کے دُکھ درد'
مایوسیوں اور محرومیوں کا شدید احساس ہوتا ہے جس میں ظریفانہ انداز اختیار کر کے وہ قاری
کو مسکرانے پر مجبور کردیتے ہیں لیکن اس کے فوراً ہی بعد سوچنے کا عمل شروع ہوتا ہے جو کافی
دلدوز اور المناک پہلو لیے ہوتا ہے مثلاً ''سورج گہن کی یاد میں'' اندھا فقیر یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے:

''بھائی صاحب مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں چشمہ لگائے بغیر سورج کی
طرف دیکھوں تو کہیں میری آنکھوں میں بینائی نہ آجائے۔ میرا ذریعہ معاش

یہی اندھا پن ہے اگر یہ چلا گیا تو بھوکوں مرجاؤں گا۔ میں دنیا کو اپنی آنکھ سے نہیں پیٹ کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں'' ۲۴

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں جس میں کلرکوں کی حالتِ زار کو پیش کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے اور سماج کے اس اہم طبقہ کی زندگی کے ایسے کڑوے سچ سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس سے وہ روزانہ نبرد آزما ہوتا ہے۔ مضمون میں ایک ڈائریکٹر کا کتا ایک کلرک کا ٹفن باکس لے کر بھاگ جاتا ہے جس کے پیچھے کلرک یہ کہتا ہوا دوڑتا ہے:

''دوستو! ٹفن باکس اس کے منہ سے چھینو' یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اگر کتے نے اس ٹفن باکس کو کھول لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتہ نہیں کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن باکس میں ڈال کر لاتا ہوں' پھر یہ اکلوتی چپاتی بھی اس قابل نہیں کہ اسے ڈائریکٹر صاحب کا کتا کھا سکے''۔ ۲۵

اس قسم کی کئی مثالیں ان کے مجموعوں میں جابجا بکھری پڑی ہیں جس میں سماج کے دبے کچلے اور مجبور انسانوں کے تئیں ہمدردی کا احساس کلیدی اہمیت کا حامل ہے جو انہیں اسپینی شاعر *(Spanish Poet)* گارسیا لورکا *(Garsia Lorca)* کے مدِ مقابل لا کھڑا کرتا ہے جس نے اپنی مزاحیہ شاعری سے سماج میں قہقہوں کے ایسے ہی طوفان کھڑے کئے ہیں جیسے مجتبیٰ حسین نے اپنی مزاحیہ نثر نگاری سے۔ دونوں ہی کی تخلیقات میں غم واندوہ کا عنصر مشترک ہے۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ ادب کو سماج کا آئینہ اور تنقید حیات قرار دیا گیا ہے کیوں کہ کوئی بھی فن پارہ اس وقت تک اچھے ادب کے دائرے میں داخل نہیں ہو سکتا' جب تک وہ سماج کی سچی عکاسی نہ کر سکے۔ ایسا کرنے کے لیے ادیب کو سماج کے اِرد گرد بکھرے ہوئے مواد سے ہی اپنا مواد حاصل کرنا ہوگا اور پھر اسے تفریح' تطہیر' تقدیس اور کشف کے مراحل سے گزرنا ہوگا تبھی جا کر اس فن پارے کو وقار واعتبار حاصل ہو سکے گا۔ اس عمل کے بغیر کوئی تحریر کاغذ پر بکھری ہوئی سطریں تو کہیں جا سکیں گی لیکن ان سطروں کو ادب کے زمرے میں شامل نہ کیا جا سکے گا۔ ایک اچھا طنز ومزاح نگار اس بات سے قطعاً انحراف نہیں کرے گا کہ ہنسنا اور ہنسانا سماجی اقدار کی مدد کے بغیر ممکن نہیں کیوں کہ ہم نہ صرف سماجی اقدار سے انحراف پر

ہنستے ہیں بلکہ ایسی چیزوں اور واقعات پر بھی ہنستے اور مسکراتے ہیں جو سماج میں موجود مروّجہ و مسلمہ اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں یعنی مسکرانا ہنسانا یا قہقہہ لگانا سماج کا تادیبی ہتھیار ہے جس میں طنز و مزاح نگار ایک نئے تیکھے اور انوکھے ویژن کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتا ہے اور اس کے ذریعہ فراہم کردہ قہقہے قاری کو لطف و انبساط سے سرشار کرتے ہیں۔ اسی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ وہ اپنے سبھی طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مواد اپنے اِردگرد کی زندگی سے ہی اخذ کرتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ خود کو بھی طنز کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ وہ سوئفٹ کی اس تعریف سے بالاتر نظر آتے ہیں جس میں اس نے طنز کو ایسا آئینہ قرار دیا ہے جس میں سوائے اپنے سب کی کمزوریاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ موصوف نے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے حوالے سے سماج و معاشرے کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو انہیں قاری کے سامنے ایک مصلح کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ انہوں نے ایسے کئی مضامین لکھے ہیں جس میں وہ اپنا یا اپنی بیوی کا بڑی خوبی سے مذاق اُڑاتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ بیوی کا مذاق اڑانا بھی خود کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے کیوں کہ بیوی تو شریک زندگی ہے۔ وہ اپنے طنز کا نشانہ دوسروں سے زیادہ خود اپنی ہی ذات کو بناتے ہیں جو اچھے طنز کی بنیاد قرار دی گئی ہے۔ ایک ایسا فن کار جو اپنے اردگرد سے موضوعات کا مواد حاصل کرلے اور خود کو بھی مذاق کا نشانہ بنالے، کبھی پابندِ موضوع نہیں ہوتا بلکہ اس کے یہاں موضوعات میں تنوع ہوتا ہے، جدت ہوتی ہے، نیا پن ہوتا ہے اور رنگا رنگی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چلتی پھرتی زندگی کی ہر ادا، ہر بانکپن اور ہر کیفیت کو اپنی قلم کی زد میں لے لیا ہے اور بات سے بات پیدا کرتے چلے گئے ہیں۔ انہوں نے واقعہ نگاری، جزئیات نگاری اور شوخیِ طبع سے ایسے مرقعے اُبھارے ہیں جو قاری کو زیرِ لب مسکرانے بے ساختہ ہنسنے یا قہقہے لگانے پر مجبور کردیتا ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ پطرس کی طرح ظریفانہ واقعہ نگاری سے فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں تو کبھی کبھی رشید احمد صدیقی کی طرح شعر و ادب سے اکتساب فیض حاصل کرتے ہیں جن کی مثالیں ''تکلف برطرف'' سے لے کر ''آخرکار'' تک کے تقریباً سبھی مضامین میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی شاعر یا مصنف کے اسلوب کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک کہ اس کا تخلیقی سرمایہ ہمارے سامنے موجود نہ ہو۔ اسی لیے میں نے ان کے پہلے مجموعہ سے لے کر شائع شدہ تمام مجموعوں کا مطالعہ کیا تا کہ ان کے

اسلوب کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اسلوب دراصل انگریزی لفظ Style کا انگریزی ترجمہ ہے۔ جو کہ ایک یونانی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ہاتھی کے دانت یا لکڑی دھات سے بنا ہوا نوکیلا اوزار یعنی اسلوب ایک آلہ اور اوزار ہوتا ہے جس کے سہارے کوئی ادیب، شاعر یا مصنف اپنی بات کہتا ہے۔ اگر ناقدین ادب کی بات پر بھی تکیہ کیا جائے تو ہمیں اسی قسم کے خیالات ہر جا بکھرے نظر آئیں گے۔ مثلاً ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی تصنیف ''اُردو اسالیب بیاں'' میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''اسلوب مصنف کی تمام زندگی کا عکس ہوتا ہے''۔ ۲۶

ڈاکٹر امیر اللہ اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''اسلوب نام ہے اس آواز کا جس کی صورت گری ان علامتوں سے ہوتی ہے جو لفظوں کی شکل اختیار کر کے ایک مفہوم ادا کرتی ہے۔ ان لفظوں سے جملے اور عبارتیں اور ان سے زبان وجود میں آتی ہے۔ یہ آواز جو پہچانی جاتی ہے، اپنی تلخی و شیرینی سے، سختی، گرختگی، نرمی اور ملائمی سے یہ آواز اونچی نیچی، مدھم، بھاری، مضبوط و مہین ہوسکتی ہے۔ یہ کانوں کے پردے بھی پھاڑ سکتی ہے اور اس میں رس بھی گھول سکتی ہے تاہم یہ مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہے''۔ ۲۷

بہ قول علی افاد فیتحی:

''فن کار جب اپنے مشاہدے اور مطالعے کو سکوڑتا اور منضبط کرتا ہے اور اپنے بکھرے ہوئے تاثرات کو ایک رشتے میں منسلک کرتا ہے اور انہیں لسانی شکل عطا کرتا ہے تو اسلوب جنم لیتا ہے''۔ ۲۸

دراصل اسلوب ہی سے کسی ادیب کی شخصیت اور اس کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔ اس بات کو حامد اللہ افسر نے ان الفاظ میں رقم کرتے ہوئے لکھا ہے:

اسلوب بیان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف کی شخصیت نمایاں رہتی ہے''۔

جارج لوئس بوفان کا قول ہے کہ:

''اسلوب خود مصنف کی شخصیت ہے۔ اسلوب بیان میں مصنف کی

ذاتی اور شخصی خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔[۲۹]

یہ حقیقت بھی ہے کہ عبارت میں صاحب عبارت کی جلوہ گری کسی نہ کسی طرح ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔یعنی اسلوب یا طرز ادا میں شخصیت کے انعکاس کی وجہ سے طرز اور صاحب طرز دونوں کی شناخت کے خطوط متعین اور واضح ہوتے ہیں۔ اسلوب اور اسلوب نگار کے ان رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی رقم طراز ہیں:

''ادیب کے شخصی ذہن میں اجتماعی محرکات بھی دخیل رہتے ہیں۔ہم شخصیت کے اس پہلو کو جن پر بیرونی محرکات اثر کرتے ہیں، معاشرتی روابط میں اچھی طرح پہچان سکتے ہیں۔ایک فن کار کی شخصیت کے یہ پہلو بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں جن کو اجاگر کرنے میں معاشرتی روابط کام نہیں آسکتے۔اس لیے کہ باوجود سخت بندشوں اور کڑی روک ٹوک کے کسی نہ کسی شکل میں وہ ادب میں اپنے کو نمایاں کرلیتے ہیں۔شخصیت کے بعض اہم اور بنیادی جوہر سطح سے بہت نیچے رہنے اور سرگرم عمل رہتے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں ادب کی تخلیقات میں سرایت کرجاتے ہیں۔سطح کے نیچی والی دنیا سے ہمارا ربط محض تحلیل فنی کے ذریعہ قائم ہوتا ہے''۔[۳۰]

مجموعی تعریفوں میں سے دو تعریفیں پروفیسر شبیہ الحسن اور حامد اللہ افسر نہایت اہمیت کی حامل ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ ادیب کا ذہن انفرادی و اجتماعی سرگرمیوں کے امتزاج سے مہمیز ہوکر مواد حاصل کرتا ہے۔جس میں اس کی شخصیت کی واضح عکاسی ہوتی ہے اور یہی چیزیں اس ادیب، شاعر یا مصنف کے اسلوب کی تشکیل کا عمل انجام دیتی ہیں۔اسلوب کی مندرجہ بالا تعریفوں کے پیش نظر جب ہم مجتبیٰ حسین کی تحریروں کو پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز و ممیز نظر آتے ہیں۔اگر ان کی تحریروں میں شوخی و شگفتگی ہے تو بلا کی سادگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کا بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ وہ معمولی بات کو بھی غیر معمولی بنا کر پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ان کے اسلوب پر سیر حاصل بحث آئندہ صفحات میں درج کی جائے گی۔میں یہاں ان کے منفرد اسلوب کی ایک جھلک پیش کرنا چاہوں گا جس میں انہوں نے فنطاسیہ (Fantasy.) کے ذریعہ طنز و مزاح کے شرارے بکھیر دیئے ہیں۔اس قسم کی مثالیں اردو کا آخری قاری، مرزا غالب کی پریس کانفرنس، شاعروں کی حکومت وغیرہ میں بھی جا بہ جا دیکھی

جاسکتی ہیں۔ حالاں کہ ان تمام مضامین میں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے‘ طنز کے عناصر زیادہ نمایاں ہیں۔ پھر بھی انہوں نے ان مضامین میں مزاح کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں جس کا جواب نہیں اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انہوں نے ان مضامین میں اردو زبان وادب کی پُر آشوب صورت حال‘ شاعروں کی حالت زار‘ نام نہاد جمہوری نظام حکومت وغیرہ پر اتنے کاری ضرب لگائے ہیں جو بڑے بڑے دانشوروں اور نقادوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ دیکھیں یہ اقتباس جس سے میرا مطمحِ نظر مزید واضح ہو جائے گا:

> ''شاعروں کی حکومت نے ایک اور فیصلہ کے ذریعہ سماجی تقریبات میں مشاعروں کو لازمی قرار دے دیا اور ہر ضلع اور تعلقہ کی سطح پر صدرِ مشاعرہ کے عہدے تشکیل دے دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ مشاعرے ہونے لگے۔ کسی کا چہلم ہوتا تو اس کے ساتھ مشاعرہ بھی ہوتا۔ کسی بچہ کی سالگرہ ہوتی تو مشاعرہ‘ کسی کا چھلہ ہوتا تو مشاعرہ‘ کسی کی برسی ہو تو مشاعرہ گویا ہر طرف مشاعرہ ہی مشاعرہ ہو گیا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ زندگی مشاعرہ در مشاعرہ گزرنے لگی عرض کیا ہے! توجہ چاہتا ہوں! اور مکرر ارشاد! تو گویا روزمرہ میں شامل ہو گئے۔ سماج کا ڈھانچہ بدل گیا۔ شاعروں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جانے لگا''۔ ۳۱

لیکن جب شاعروں کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔ تب معاشرے میں ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس کا بیان وہ بڑے ہی منفرد انداز میں یوں کرتے ہیں:

> ''ماضی کے حکمراں شاعر اب پھر سڑکوں پر آجاتے ہیں۔ جو ٹھیک سے آپ کے سلام کا جواب تک نہیں دیتے تھے‘ وہ آج آپ کو ایک میل دور سے سلام کرتے نظر آتے ہیں۔ کسی کو شعر سنانا چاہتے ہیں تو وہ بے نیازی سے کہتا ہے‘ میاں معاف کرو اور آگے کا راستہ ناپو اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو‘ شعر سناتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی‘ محنت کیوں نہیں کرتے''۔ ۳۲

مجتبیٰ حسین کے فن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مزاحیہ مضامین افسانوی اور ڈرامائی عناصر سے لبریز ہوتے ہیں جن میں وہ واقعات‘ لطیفوں اور پیکروں کا ایسا سلسلہ قائم کرتے ہیں‘ جس سے قاری کی دلچسپی لمحے بھر کو ختم نہیں ہوتی خواہ وہ اُردو کا آخری قاری ہو‘

'ڈائریکٹر کا کتا' ریل منتری مسافر بن گئے' یہ رکشا والے یا پھر اور کوئی دوسرا مضمون ہی کیوں نہ ہو۔ سبھی میں وہ واقعات کا ایسا تانا بانا بنتے چلے جاتے ہیں جس سے قاری کی نظروں کے سامنے سارے مناظر یکے بعد دیگرے کسی ڈرامائی سین کی طرح وقوع پذیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ''ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے ڈاکٹروں کے'' کی چند سطریں' جس میں مجتبیٰ حسین نے ڈاکٹروں کے پیشہ ورانہ طرز پر طنز کے بھرپور تیر چلائے ہیں:

''ایک بار کا ذکر ہے کہ ہم ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو وہ حسب دستور گھوڑے پر سوار تھے۔ ہمارے جاتے ہی انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' ہمارے منہ میں ایک تھرمامیٹر ٹھونس دیا' نبض دیکھی' آنکھیں چیر کر دیکھ ڈالیں' جبڑوں کے نیچے غدود کو ٹٹولتے رہے' گردن کو جھٹکے دے دے کر ہلایا' بال پکڑ کر نوچ ڈالے' منہ پر طمانچہ رسید کیا پھر گوشمالی کرنے لگے اور ہم ان ساری حرکتوں کے جواب میں تھرمامیٹر کو اپنے منہ میں پکڑے نہایت سعادت مندی کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھے رہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ انہوں نے اچانک ہماری آستین اوپر چڑھائی اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ انجکشن کی سرنج ہمارے ہاتھ میں دھنسا دی۔ ہم درد کے مارے مچل اٹھے' ہمارے منہ سے تھرمامیٹر گر پڑا اور ہم چیخنے لگے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے غصہ سے کہا۔ ''میاں اب چپ رہو' کیا چھوٹے بچے ہو جو انجکشن کا درد بھی برداشت نہیں کر سکتے''۔ اس پر ہم نے ڈاکٹر صاحب کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''مگر ڈاکٹر صاحب میری بات تو سنئے' اصل میں میں بیمار نہیں ہوں بلکہ میں تو اپنے ماموں کے مرض کی کیفیت بیان کرنے آیا ہوں''۔ [۳۳]

بلاشک وشبہ مجتبیٰ حسین ایسے مزاح نگار ہیں جو ڈرامائی صورت حال سے تو مزاح پیدا کرتے ہی ہیں' ساتھ ہی چھیڑ چھاڑ اور طنز وتعریض سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں' جس میں تضاد' تناسب اور توازن سبھی کچھ موجود ہوتا ہے۔ شاید انہیں خصوصیات کے پیشِ نظر شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''ہنسی پیدا کرنے والے واقعات تو ہما شما سب نکالتے ہیں لیکن زبان

کو اس طرح برتنا کہ تضاد، تناسب اور توازن کے ذریعہ ہنسی والی بات بن جائے، ہر ایک کا کام نہیں۔ مجتبیٰ حسین ان تینوں طریقوں کو بہت خوبی سے برتتے ہیں''۔ ۳۴

مندرجہ بالا خصوصیتیں ان کے مضمون ''لائبریری میں چند گھنٹے'' میں بہ خوبی دیکھنے کو ملتی ہے جس میں انہوں نے نہایت ہی پابندی سے لائبریری آنے والے ایک قاری کے متعلق اس طرح خامہ فرسائی کی ہے:

''یہ صاحب لوگوں کی نظریں بچا کر کتابوں میں سے نیم برہنہ تصویریں نکال لیتے ہیں۔ ایک دن میں نے انہیں ایک کتاب میں سے برہنہ تصویر نکالتے ہوئے پکڑ لیا تو انہوں نے نہایت معصومیت کے ساتھ مجھ سے کہا'' قبلہ یہ تصویریں میں اس لیے نکال رہا ہوں کہ وہ نہایت عریاں ہیں اور کتاب میں اس کے موجود رہنے سے قارئین کے اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا میں خدمت خلق کے طور پر ان کو کتاب سے علاحدہ کر رہا ہوں''۔ میں نے کہا مگر اس تصویر سے آپ کے اخلاق پر بھی تو برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس پر وہ بولے'' کوئی بات نہیں آپ میری فکر نہ کریں۔ میرے اخلاق پہلے ہی سے اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ اب ان میں مزید بگڑنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے''۔ ۳۵

اسی طرح ''عید کی تیاری'' اور ''کیلنڈر جمع کرنے والے'' مضمون میں انہوں نے یوں مزاحیہ پہلو نکالا ہے۔

''ہم نے ایک گوالے کو دیکھا جو بالٹیوں میں پانی بھر کر لئے جا رہا تھا۔ ہم نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے وہ بولا'' جی کچھ نہیں ذرا عید کی تیاری ہو رہی ہے''۔ ۳۶

''کپڑے بنانے والی کمپنیاں ہمیشہ اپنے کیلنڈروں پر ایسی حسیناؤں کی قد آدم تصویر چھاپتی ہیں جن کے بدن پر گھڑی اور انگوٹھی کے سوا کوئی لباس نہیں ہوتا''۔ ۳۷

آرتھر کوسلر کے مطابق طنز جانی بوجھی چیزوں کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرنے کا نام

ہے یعنی مبالغہ آمیزی (Exaggeration) طنز و مزاح کی بنیادی خصوصیت ہے اور ایک اچھا مزاح نگار مبالغہ آمیزی میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ لیکن یہ فن ایسا نازک فن ہے جس میں تھوڑی سی چوک ہونے سے مزاح بوجھل ہو جاتا ہے یعنی موضوع اور انشاء کی لطافت مجروح ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس بات کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے کہ کبھی بھی مبالغہ طوالت کی حد میں داخل نہ ہونے پائے اور موضوع کی شادابی سے مبالغے کی دل نوازی کا رشتہ استوار رہے۔ مجتبیٰ حسین کے تقریباً سبھی مضامین میں اس وصف کے کئی لطیف پہلو پوری دلکشی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ایک مثال جس میں ان کی مبالغہ آمیزی عروج پر نظر آتی ہے اور جسے قاری بغیر کسی پس و پیش کے تھوڑی دیر کے لیے ہی صحیح مسرت کے ساتھ حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتا ہے:

> ''ایک بار ہم نے ایک بوڑھے فقیر پر رحم کھا کر ایک پیسہ دینے کی کوشش کی۔ اچانک کئی فقیر ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہم ان سے بچنے کے لیے آگے بڑھے تو سارے فقیر ہمارے پیچھے ہو لئے۔ ہم ایک میل تک اسی طرح آگے آگے چلتے رہے۔ فقیر نہ صرف ہمارے پیچھے چلتے رہے بلکہ اس غول میں نئے فقیر بھی شامل ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہم فقیروں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہے ہیں''۔ ۳۸

تمام نثری ادب میں مزاح نگاری ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں مزاح نگار کو دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ آسانیاں حاصل ہوتی ہیں کیوں کہ وہ من مانے ڈھنگ سے الفاظ اور محاوروں پر تصرف کا حق رکھتا ہے۔ جس سے نئی نئی جہتیں روشن کی جاسکتی ہیں اور بے شمار مضحک پہلو اجاگر کئے جا سکتے ہیں۔ اس خوبی کے ساتھ ہی ساتھ ایک مزاح نگار کو دوسرے تمام فن کاروں سے زیادہ الفاظ کا مزاج شناس بھی ہونا چاہئے کیوں کہ اسے تو اپنے مزاحیوں کا تانا بانا' الفاظ کے مختلف Shades اور مفاہیم سے ہی بننا پڑتا ہے۔ طنز و مزاح میں الفاظ محض معنی ادا کرنے' فضا پیدا کرنے یا تلازموں کا سلسلہ جوڑنے کے کام نہیں آتے بلکہ یہ خود دنیائے مزاح کی وسعت لیے ہوتے ہیں جس میں کبھی ان کے مفاہیم میں باہمی اختلاف' کبھی ان کے تلازمے اور مفہوم کا تضاد' کبھی سیاق و سباق کے در پردہ بدلتی ہوئی معنویت تو کبھی ان

کے صوتی آہنگ سے کام لے کر مزاح پیدا کیا جاتا ہے کم سواد مزاح نگار اس میدان میں ٹھوکریں کھاتے نظر آتے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین اس قسم کے تصرف پر قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں. جس کی وجہ سے ان کے مزاحیہ شہ پاروں میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب کی تشکیل میں مکالماتی طرزِ بیان کو بہت ہی عمدہ طریقے سے برتتے ہوئے کرداروں کا ایسا نگار خانہ سجا دیا ہے. جس میں وہ ہمارے سامنے اصلی روپ میں نظر آتا ہے۔ اس کی واضح مثال 'قطع کلام' کا وہ مضمون ہے. جس میں سند باد جہازی نے اپنی سیر و سیاحت کا مقصد بیان کرتے ہوئے بعض نہایت تلخ حقیقتوں پر سے ظریفانہ انداز میں پردہ ہٹایا ہے اور ہم مضمون کے پہلے جملے سے ہی سند باد کے ساتھ طنز و مزاح کے سمندر میں غوطہ زن ہونے لگتے ہیں۔ اس سے قبل کہ مثالیں دی جائیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کا خلاصہ بیان کرتا چلوں تا کہ قارئین ہمارے یہاں کے فسادات' لیڈروں کی کارستانیاں' عوام کی اذیتوں وغیرہ کا قدرے اندازہ کر سکیں۔

درحقیقت یہ سفرنامہ سند باد جہازی کو ایک حقیقی سفر کے بعد تحریر کرنا تھا جس کا مقصد ہندوستان میں فسادات کے منظر کا احوال بیان کرنا تھا لیکن وہ ہندوستان کے جس شہر میں وارد ہوتا' وہاں فسادات ختم ہو چکے ہوتے ہیں' اسی درمیان اس کی ملاقات ایک لیڈر سے ہو جاتی ہے جو فسادات کے مناظر دکھانے کا وعدہ کرتے ہوئے تیس ہزار روپے وصول کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں فساد کرائے دیتا ہوں۔ کیوں کہ ہندوستان میں فساد کرانا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کے لیے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا ہونا شرط ہے۔ کیوں کہ ان دونوں کے اتحاد کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون میں مجتبیٰ حسین نے اپنے اسلوب کی شگفتگی اور حقیقت آمیز تلخی کو نہایت ہی فن کارانہ انداز میں برتا ہے اور فسادات میں انسان جن اذیتوں سے دوچار ہوتا ہے' اس کی نہایت دلخراش منظر کشی کی ہے اور انسان کو خود احتسابی کی دعوت دی ہے. جس میں سند باد کا یہ جملہ .... میں اکثر نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور چیخنے لگتا ہوں ...... میرا سارا وجود ایک نیزہ بن گیا ہے جس پر ایک معصوم بچے کا سر لٹکا ہوا ہے۔

اب پیش ہے اس مضمون کے چند اقتباسات جو موصوف کے فن پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی تحریریں ابتذال اور مسخرے پن سے پاک ہیں۔ مجتبیٰ حسین اس بات سے بہ خوبی واقف

ہیں کہ جس شخص کو اس قسم کی بری لت لگ گئی' اس کا فن پست تر ہوتا چلا جائے گا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اعلیٰ طنز و مزاح فن کار کی دراکی' قوت مشاہدہ اور قوت اظہار کا مرہون منت ہوتا ہے نہ کہ مسخرے پن کا۔ علاوہ ازیں موصوف کی نگارشات میں جو بات سب سے زیادہ دلکش محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان کا سیدھا سادا بیانیہ طرز تحریر ہے جس میں خود بہ خود مزاح اور خوش طبعی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں آمد ہی آمد ہے اور کہیں بھی' بلکہ دور دور تک آورد کا گمان نہیں ہوتا۔ زود نویسی کے باوجود وہ اپنے قلم کو اسی وقت زحمت دیتے ہیں' جب انہیں کوئی نئی اور خاص بات کہنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اوروں کی طرح خود کو دہراتے نہیں۔ ان کے مضامین اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کو صفحۂ قرطاس پر اُتارتے وقت اپنی سبھی پانچوں حسوں کو جگائے رکھتے ہیں تاکہ ان کے مشاہدے سے کوئی بھی شئے اوجھل نہ ہونے پائے اور نہ ہی کوئی ایسی شئے داخل ہو جائے جو ان کے فن کو مجروح کردے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں جس سے محولہ بالا نکات اور واضح ہو جائیں گے۔

''حضرات! میں سند باد جہازی ہوں' وہی سند باد جہازی جو سفر کم کرتا تھا اور سفرنامے زیادہ لکھتا تھا بلکہ اکثر سفرنامے سفر کئے بغیر ہی لکھ دیتا تھا''۔ ۳۹

''فسادات برپا کرنا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ برسوں کے ریاض کے بعد اب ہم نے اس فن میں وہ مہارت حاصل کر لی ہے کہ کسی وجہ کے بغیر ہی فساد برپا کر دیتے ہیں۔ فساد کے لیے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا ہونا ضروری ہے' ان دونوں کے اتحاد کے بغیر فساد کا ہونا ممکن نہیں۔ ۲۶۔ اگر ایک ہندو نے کسی مسلمان کی طرف گھور کر دیکھا تو یہ بات خود ایک ہنگامہ خیز فساد کے لیے بہت کافی ہے۔ ہندو اور مسلمان کی بات تو چھوڑیئے اگر کسی مسلمان کے کتے نے کسی ہندو کے کُتے پر بھونکنا شروع کیا تو سمجھ لیجئے کہ فساد کی بنیادیں تعمیر ہو رہی ہیں''۔ ۴۰

''کسی نے بتایا کہ وہ (لیڈر) امن کمیٹی کا صدرنشین بن گیا ہے اور کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کر رہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا' وہ فساد میں ہلاک ہونے والوں کی یاد میں اپنی آنکھوں سے خشک آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے کہا'' فسادات ہمارے ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں'

ہمارا سر شرم سے جھک گیا ہے''۔ میں حیران نظروں سے اس لیڈر کو یوں دیکھتا رہا جیسے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو''۔ ۴۱

''میں فسادیوں کی نظر بچا کر بھاگ کھڑا ہوا اور کئی دنوں تک بھاگتا رہا۔ ایک دن بالآخر میں اپنے وطن پہنچ گیا لیکن مجھے اب بھی محسوس ہوتا ہے جیسے میں مسلسل بھاگ رہا ہوں اور فسادی میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ اب ہندوستان کے تاج محل، ایلورا اور اجنتا تو مجھے یاد نہیں رہے، ہاں وہاں کے فسادات کی یاد تازہ ہے اور اس قدر تازہ ہیں کہ میں اکثر نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور چیخنے لگتا ہوں ''مجھے لیڈر سے ایک بار مل لینے دو'' اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سارا وجود ایک ایسا نیزہ بن گیا ہے جس پر ایک معصوم بچے کا سر لٹکا ہوا ہے''۔ ۴۲

''جو ڈاکٹر جتنا بد خط ہوگا، اُتنا ہی وہ اپنے فن میں ماہر ہوگا۔ ایک ڈاکٹر صاحب کی محبوبہ کے پاس جب بھی ڈاکٹر صاحب کا محبت نامہ آتا ہے تو وہ اس محبت نامے کو لے کر کسی کیمسٹ (Chemist) کے پاس چلی جاتی ہے اور اس سے محبت نامہ پڑھوا لیتی ہے''۔ ۴۳

اس قسم کے بے شمار جملے، فقرے بلکہ کبھی کبھی پورا کا پورا پیراگراف مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں منتشر نظر آئے گا جو ان کے مزاح کو سندِ قبولیت عطا کرتا ہے۔ ان کی زبان میں نہ صرف سادگی اور روانی ہے بلکہ ان کے یہاں طنز کی نشتریت اور بلا کی برجستگی بھی موجود ہے۔ وہ اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ طنز کے ذریعہ حقیقت زیادہ آشکار کی جاسکتی ہے، جس کا اعتراف کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی نے بھی ایک جگہ لکھا ہے:

''طنز کا مقصد حقیقت ہوتا ہے اور حقیقت بلاشبہ تلخ ہوتی ہے۔ اس تلخی کو ایسے الفاظ میں بیان کرنا کہ اس شخص اور سماج کو تو کم نقصان پہنچے لیکن غیر شعوری طور پر اس کی اصلاح ہو جائے کہ جس پر وار کیا گیا ہے حقیقی طنز ہے''۔ ۴۴

احتشام حسین نے بھی طنز اور حقیقت کے رشتہ پر زور دیا ہے۔ ان کی نظر میں:

''حقیقت کا ادراک کئے بغیر طنز پیدا ہی نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اگر

کسی کے پاس حقیقت کا کوئی تصور نہیں ہے، وہ کسی قسم کے توازن کی جستجو نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص طنز کا استعمال نہیں کرتا''۔[۴۵]

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ طنز کے لیے حقیقت کا اِدراک اور سماجی شعور کی اشد ضرورت ہوتی ہے جو مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں بدرجہ اتم نمایاں ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ طنز نگار ہیں بلکہ وہ ایسے طنز و مزاح نگار ہیں جس کے ہر جملے میں بلا کی شیرینی اور حلاوت ہوتی ہے اور طنز کے باوجود بھی خوش طبعی اور شگفتگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ انہیں زبان کو مزاحیہ طریقے سے برتنے کا فن آتا ہے جو ان کی تخلیقات کو آب و رنگ بخشتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک اچھے ادیب کے تمام حربے اپناتے ہیں مثلاً جزئیات نگاری، محاکات نگاری، پیکر تراشی وغیرہ چند مثالیں پیش ہیں جن سے مذکورہ نکات کی وضاحت ہو جائے گی۔

''تھوڑی دیر بعد اچانک سانپ کے پھنکارنے اور سانپ کو مارنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ سات بج گئے ہیں اور ہمارے دوسرے پڑوسی کے گھر میں نل کھل گیا ہے اور ان کی نوکرانی لکشمی بائی نہ صرف آ چکی ہے بلکہ کپڑے بھی دھونے لگی ہے''[۴۶]

''اگر آپ خالص فسادات دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہندوستان ہی جائیے۔ یہاں کے فسادات اتنے خالص ہوتے ہیں کہ ان میں کہیں بھی انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ اس صفائی سے انسانوں کے سر کاٹے جاتے ہیں اور ان کے جسموں میں چھرے بھونک دیئے جاتے ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ فرقہ وارانہ فساد ہندوستان کا بڑا قدیم کھیل ہے۔ اگر اس کھیل کو نہ دیکھا تو اس دینا میں پیدا ہونے کا مقصد ہی کیا ہوا۔ ایک اور دوست نے کہا'' ویسے ہندوستان میں تاج محل، ایلورا اور اجنتا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن فرقہ وارانہ فسادات کی تو بات ہی جداگانہ ہے''۔[۴۷]

مجتبیٰ حسین کے تقریباً سبھی مزاحیہ مضامین بلا کی تازگی اور انفرادیت لئے ہوئے ہیں جس میں تشبیہات عموماً موضوع اور نفس موضوع دونوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انہیں گھسی پٹی تشبیہوں اور استعاروں کو بھی ایک نئی تمکنت کے ساتھ پیش کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ اپنے مضامین میں وہ مرئی شئے کو غیر مرئی شئے سے تشبیہ دیتے ہیں جس سے کسی داخلی تجربے یا تجسیم کا

احساس ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ تشبیہ کو اتنی وسعت دیتے ہیں کہ وہ تمثیل معلوم ہونے لگتی ہے۔ ذیل کے اقتباس میں یہ سبھی خوبیاں یکجا دیکھنے کو ملیں گی۔

''ہم ذاتی طور پر نئے سال کی خوشیاں اس لیے نہیں مناتے کہ نیا سال آگیا بلکہ خوشی اس بات کی مناتے ہیں کہ پرانا سال گزر گیا اور ہم نہیں گزرے۔ تب ہم پرانے سال کی طرف یوں حقارت سے نظر ڈالتے ہیں جیسے کشتیوں کے دنگل میں فتح پانے کے بعد کوئی پہلوان' ہارے ہوئے پہلوان کی طرف فاتحانہ نظر ڈالتا ہے۔ سچ پوچھئے تو پرانا سال بھی ایک پہلوان ہوتا ہے جس سے آپ مسلسل ۳۶۵ دن فری اسٹائل کشتی لڑتے ہیں۔ وہ آپ کو گھونسے رسید کرتا ہے' کبھی دھوبی پچھاڑ دے ڈالتا ہے' کبھی آپ اس کے سینے پر سوار ہوجاتے ہیں اور وہ کبھی آپ کے سینے پر مونگ دلنے لگتا ہے''۔ ۴۸

مجتبیٰ حسین لفظوں کے اچھے پارکھ ہیں۔ انہیں ذو معنیٰ الفاظ' رعایت لفظی' الفاظ کی تکرار وغیرہ سے مزاح پیدا کرنے پر عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر مضامین میں نئی نئی معنوی جہتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں جو ظریفانہ عناصر سے لبریز ہوتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہ مثالیں۔

''جب ریس کا سیزن آتا ہے تو اچھا خاصا آدمی بے لگام ہوجاتا ہے''۔ ۴۹

''جس گھر میں مہمان زیادہ آتے ہیں' اس گھر میں کبھی کوئی چور نہیں آتا کیوں کہ چور کو معلوم رہتا ہے کہ جس گھر میں مہمان آتے ہوں' وہاں چوروں کے لیے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے''۔ ۵۰

''یار میں کام کرنے کے لیے رجسٹر میں دستخط نہیں کرتا بلکہ دستخط کرنے کو ہی سب سے بڑا کام سمجھتا ہوں''۔ ۵۱

''چالاک مہمان وہی ہوتا ہے' جو شب خون مارے'' ۵۲

''سیب درختوں اور نوخیز دوشیزاؤں کے گالوں میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بڑا خوش رنگ پھل ہوتا ہے۔ سیب وہ واحد پھل ہے جسے دیکھ کر سیب کا نہیں معشوق کے گالوں کا خیال آتا ہے''۔ ۵۳

''ادب میں اتنے تجربے کئے گئے کہ ادب لیبارٹیری میں تبدیل
ہو گیا ہے۔ ہر ادیب نے اس کو ایک نیا موڑ دینا چاہا۔ چناں چہ ہمارا ادب
اتنا مڑا تڑا ہو گیا ہے کہ اسے دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ برسوں بعد کسی
گھڑے میں سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں''۔ ۵۴

مجتبیٰ حسین کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی محاوروں' ضرب الامثال' مصرعوں اور اشعار کا برجستہ اور برمحل استعمال ہے۔ ان کے یہاں محاورے' ایہام اور صنعتِ تجنیس وغیرہ بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں کبھی کبھی بڑے ہی دل فریب انداز میں تحریف بھی کی گئی ہے جس سے محاورے کی سنجیدگی ختم ہو جاتی ہے اور ایک ایسا مضحک پہلو اُبھر کر سامنے آتا ہے جو قاری کو گدگدائے بغیر نہیں رہتا۔ ''مرزا غالب کی پریس کانفرنس'' کی یہ عبارت دیکھیں:

''اخباری نمائندوں نے جو پہلے ہی سے اس موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے' مرزا غالبؔ پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ ایک صحافی نے پوچھا'' ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے''؟ دوسرے صحافی نے پوچھا'' کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب؟'' تیسرے صحافی نے پوچھا'' نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا''؟ چوتھے صحافی نے پوچھا۔'' آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟'' پانچویں صحافی نے پوچھا'' موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟'' غالب نے اچانک اتنے سوالات کو سن کر کہا؟ آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا میرے آگے''۔ ۵۵

''چاروں طرف غالبؔ صدی تقاریب کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ یوم غالبؔ ' جشنِ غالبؔ ' یاد غالبؔ ' غالبؔ ڈے ' غالبؔ فیسٹول ' غالبؔ فنڈ ' غالبؔ میموریل ہال ' غالبؔ بال روم ڈانس ' غالبؔ کمیٹی ' غالبؔ سبھا ' غالبؔ سنستھا ' غالبؔ میلا دبھاگ ' غالبؔ کا ریہ کرم ' غالبؔ پر یہ درشنی کا اس قدر غلبہ تھا کہ غالبؔ نے حیران ہو کر خود سے سوال کیا:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے'' ۵۶

''اے ادب کے بے ادب گریجویٹ ہمارے نقار خانے میں اپنی

طوطی کو بار بار بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے''۔ ۵۷

''خدا مرحوم کے ساتھ قرار واقعی سلوک کرے اور ان کے پسماندگان کو بے صبری عطا کرے'' خدا بخشے بہت سی خامیاں تھی مرنے والے میں''۔ ۵۸

اس طرح کی بہت مثالیں ہیں جن کے ذریعہ محولہ بالا صفات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس خصوصیت سے بالاتر ان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی ضرب الامثال اور محاوروں کو ملا کر دو آتشہ تیار کر دیتے ہیں جو ان کی مزاح نگاری کو حد درجہ کی اولیت بخشتا ہے۔ بہ طور دلیل چند مثالیں پیش ہیں:

''سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کو سنتے ہی ہماری رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور ہم نے پہلے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ٹٹول کر ان کی دُکھتی رگ پکڑ لی اور کہا جناب یہ شعر غالب کا نہیں میر کا ہے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے اپنی دُکھتی رگ ہمارے ہاتھ سے چھڑا لی اور تنک کر بولے: ''بالکل یہ شعر کسی طرح بھی میر کا نہیں ہو سکتا کیوں کہ میر صاحب تو روتے روتے سو گئے ہیں، بھلا سوتے سوتے وہ کس طرح شعر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعر غالب کا ہے اور ننانوے فی صد غالب کا ہے۔'' ۵۹

''اردو شاعروں کا عشق بھی عجیب وغریب ہے، عشق کرنا ہو تو سیدھے سیدھے عشق کرو بھائی کس نے کہا تم سے کہ معشوق کی یاد آئے تو آسمان کی طرف دیکھ کر تارے گنتے رہو اس کی یاد نے زور مارا تو اپنا گریباں پھاڑنے کے لیے بیٹھ جاؤ''۔ ۶۰

''اتنے برسوں تک بھانت بھانت کے رکشاؤں میں بیٹھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب گھوڑے کی قسمت پھوٹ جاتی ہے تو وہ تانگے کے آگے جوت دیا جاتا ہے اور جب انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو وہ رکشہ چلاتا ہے اور جس شخص کی قسمت کسی وجہ سے پھوٹنے کی منتظر رہتی ہے تو وہ رکشہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ ہزار بار رکشا والوں کو سمجھاتا ہوں کہ میاں سلامتی

کی چال چلو کہ زندگی میں کلیدِ کامیابی یہی ہے تو وہ مجھ سے کہتا ہے' حضور!
سلامتی کی چال چل کر تو اس نوبت تک پہنچے ہیں اور اب مزید سلامتی کی
چال چلتے رہیں تو زمانہ قیامت کی چال چل جائے گا اور ہم منہ تکتے رہ
جائیں گے''۔ ۶۱

مندرجہ بالا عبارت میں محاوروں اور کہاوتوں کے اتنے خوب صورت تانے بانے بنے گئے ہیں' جس میں کہیں بھی ذرہ برابر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کہاوتیں اور محاورے تکلفاً یا ارادتاً لائے گئے ہیں بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سبھی محاورے یا ضرب الامثال نفس مضمون کی ضرورت کے پیشِ نظر لکھے گئے ہیں اور یہی حقیقت بھی ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو مضمون میں روانی اور برجستگی ہرگز نہ باقی رہتی۔

مجتبیٰ حسین کا فن اس وقت نہایت ہی داد طلب بن جاتا ہے جب وہ کسی ایک لفظ کو مرکزی حیثیت دے کر اسی لفظ پر اپنے مزاح کی عمارت کھڑی کرتے ہیں مثلاً ''جاپان چلو جاپان چلو'' میں چھتری پر' مزاج پُرسی کرنا ایک مشکل فن'' میں مزاج پُرسی پر ''تھوکنا منع ہے'' میں تھوکنے پر یا اپنے مزاحیہ مضمون ''ٹرین میں پڑھنا'' میں لفظ سینے پر ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اس مضمون کا اقتباس ہے جس میں انہوں نے اس لفظ سے تشکیل پانے والے محاوروں سینہ پر سوار ہونا' سینہ بہ سینہ ہونا' یا سینے پر پتھر رکھ لینا وغیرہ محاوروں کا نہایت ہی برمحل اور خوب صورت استعمال کیا ہے۔

''ٹرین جب ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو ہم اپنے سامان پر
ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہیں اور کتاب کو کھول کر برتھ پر دراز ہو جاتے
ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو کتاب اور ٹرین دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر اس
کے بعد نہ جانے کب ہماری نظروں کے سامنے کتاب کی سطریں بڑی تیزی
سے پٹریاں بدلنے لگتی ہیں اور اس کے بعد نہ جانے کب ہماری آنکھیں خود
بہ خود بند ہو جاتی ہیں۔ پھر کتاب ہمارے سینے پر سوار ہو جاتی ہے جیسے وہ خود
ہمارا مطالعہ کر رہی ہو۔ اچانک ایک جھٹکے سے ہماری نیند اُچٹ جاتی ہے۔
ہم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہمارا ہاتھ سینے پر کتاب کو تلاش کرنے لگتا ہے مگر
کتاب وہاں نہیں ہوتی۔ یہ کتاب ہمیں اپنے پاس والے برتھ کے مسافر

کے سینے پر نظر آتی ہے۔ تب ہم اس کتاب کو پڑوسی مسافر کے سینے پر سے بڑی آہستگی کے ساتھ یوں اٹھاتے ہیں جیسے ہم اس کتاب کی چوری کر رہے ہوں۔ پھر یہ کتاب ہمارے سینے پر دراز ہو جاتی ہے جب ہم دوبارہ جاگتے ہیں تو پھر اس کتاب کو اپنے پڑوسی مسافر کے سینے پر پاتے ہیں اور یہ سلسلہ منزلِ مقصود تک جاری رہتا ہے۔ کتاب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی جائے۔ درمیان میں جب بھی ہماری آنکھ کھلتی ہے تو اپنی کتاب کو کسی نئے مسافر کے سینے پر سوار پاتے ہیں پھر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب ہماری کتاب اچانک ٹرین سے غائب ہو جاتی ہے۔ ہم اسے ڈبے سے لے کر باتھ روم تک میں تلاش کرتے ہیں مگر وہ ہمیں داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔ ہم سینہ پر کتاب رکھنے کے بجائے پتھر رکھ لیتے ہیں''۔ ۶۲

مجتبیٰ حسین نہ صرف محاوروں کے برمحل استعمال پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ کسی لفظ کے محاوراتی سلسلوں کو اس خوبی سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ ضلع جگت کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہ طور دلیل دیکھیں یہ اقتباس:

''ہم نے کہا بیگم! ہم تمہاری بات سے صد فی صد متفق ہیں۔ ہمارا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ قدرت ہم سے ہماری بصیرت چھین لے۔ ہم نے سچ مچ بہت دنیا دیکھ لی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تمہیں دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ اب تمہیں دیکھنے کا لطف بھی جاتا رہا' دوستوں کی کرم فرمائیاں دیکھیں' حالات کی بے مہری دیکھی۔ اب اس دنیا میں دیکھنے کو باقی ہی کیا بچا ہے۔ اپنا انجام دیکھنا ہے سو وہ ہم نہیں دیکھتے' تم دیکھ لو تمہاری آنکھیں بھی تو ہماری آنکھیں ہیں''۔ ۶۳

ناقدین ادب اس بات پر متفق ہیں کہ تحریف نگاری مزاحیہ ادب کو دلکشی بخشنے کا ایک بہترین آلہ ہے لیکن واقعاتی مزاح کے برعکس تحریف یا پیروڈی سے وہی شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے جو ادب کا وسیع و عمیق مطالعہ رکھتا ہو اور جس کا ادبی ذوق صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہو کیوں کہ ادیب تحریف کرتے وقت کسی مصنف کے معروف جملوں' فقروں یا کسی شعر کو معمولی سے لفظی

تغیّر کے ساتھ شاملِ مضمون کرلیتا ہے یا پھر وہ کسی جملے یا فقرے' اشعار' مصرعوں یا کسی مصرعے کے جز کو بغیر کسی تبدیلی کے شامل کرلیتا ہے اور اس طرح حوالے پیش کرتا ہے کہ اس میں مزاحیہ مفاہیم در آتے ہیں یعنی بذلہ سنجی' تحریف نگاری' حاضر جوابی' حاضر دماغی اور فی البدیہہ قلقاریوں سے بھی مزاحیے تخلیق کیے جاسکتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے بھی اس قسم کے اسلوب سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ آئندہ چند مثالوں میں یہ سبھی باتیں واضح ہو جائیں گی۔

''ایک زمانہ تھا جب ہم وقت کے بڑے پابند تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا۔ ہماری پابندیٔ وقت اتنی مشہور تھی کہ لوگ ہماری سرگرمیوں کو دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیا کرتے تھے مثلاً ہمیں ادھر چھینک آئی اور لوگوں نے ادھر اپنی گھڑی میں آٹھ بجالیے۔ ہم نے جماہی لی تو لوگوں نے نو بجالئے۔ ہم نے انگڑائی لی تو گھڑی کے کانٹے بھی انگڑائی لے کر بارہ کے ہندسے پر ٹھہر گئے۔ ہم نے سڑک پر ٹھوکر کھائی تو لوگوں نے نو بجالئے اور اگر ہم بھی ٹھوکر کھا کر سڑک پر گر پڑے تو لوگوں نے کیلنڈر تبدیل کرڈالے''۔٦٤

''جب ہم اپنی مصنوعی بتیسی نکال کر سوجاتے ہیں تو بچے اس بتیسی کو کھلونے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گھنٹوں یہ اپنے ڈیڈی کے دانتوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم پوپلی شکایت کرتے ہیں تو بیوی کہتی ہے۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے' کھانا تو دس بجے کھاتے ہو' گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اگر بچے آپ کی بتیسی سے کھیل لیتے ہیں تو ایسی کون سی آفت آجاتی ہے۔ کبھی تمہیں اتنی تو توفیق نہیں ہوتی کہ بچوں کے لیے کھلونے ہی لے آؤ۔ اب بچوں نے تمہاری بتیسی کی شکل میں ایک کھلونا ایجاد کرلیا ہے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یوں بھی گھر میں ہمیشہ منہ پھلائے رہتے ہو' حسرت رہ گئی کہ بچے تمہارے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھیں جو دانتوں کا دیدار کرادے' اب اگر بچے تمہاری مسکراہٹ کے بغیر دانت دیکھ کر خوش ہولیتے ہیں تو انہیں خوش ہولینے دو کہ یہ ایک تبسّم بھی کسے ملتا ہے''۔٦٥

مندرجہ بالا سطور پر اگر غور کیا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مجتبیٰ صاحب نے نہایت

تیکھے انداز میں ایک غریب باپ اور غریب شوہر کی حالت زار کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔
اس میں طنز و مزاح دونوں ہی سامنے آتے ہیں کہ جب ایک نادار باپ اپنے بچوں کے لیے کھلونوں کا انتظام نہیں کر پاتا تو اس کی شریک حیات بھی اسے نہیں بخشتی اور طنز کے تیر چلاتی ہے اس طرح مجتبیٰ نے سماج میں موجود اس قسم کے افراد کو اپنے قاری کے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے دل میں اس شخص کے لیے بے پناہ محبت اور جذبۂ ہمدردی بیدار ہو جاتا ہے جو کہ ان کے فن کارانہ اظہار کا مرہون منت ہے۔ اب دیکھیں چند اور مثالیں جس میں انہوں نے اشعار کو بڑی خوب صورتی سے اپنے اسلوب کا حصہ بنالیا ہے۔

☆

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے "٦٦

☆

"گدھا سمجھ کے وہ چپ تھا کہ مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کہ قدم میں نے پاسباں کے لیے "٦٧

☆

وقت نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے "٦٨

مجتبیٰ حسین اپنے قاری کو گدگدانے کے لیے جہاں تمام دوسرے حربے اپناتے ہیں، وہیں وہ اپنے نہایت آزمودہ حربے محکمہ جاتی یا پیشہ ورانہ رنگ بھی اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مطالعے کے حصار میں پیشوں اور طبقوں کے لوگ آجاتے ہیں جن میں دھوبی، باورچی، نوکر، کلرک، افسر، ڈاکٹر، رکشہ چلانے والے، سیاسی لیڈران، شاعر، درویش وغیرہ سبھی شامل ہوتے ہیں جو اپنی معاشرتی اور طبقاتی زندگی سے گہرا رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ موصوف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان کرداروں کے طرزِ زندگی، ان کے مسائل، ان کے مخصوص رویوں، عادتوں، خصائل وغیرہ کا نہایت ہی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور پھر ان کے پیشوں سے متعلق مختلف تشبیہات و استعارات سے مدد لے کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً انہوں نے ایک مضمون "مرزا کی یاد میں" ایک کلرک کے ہر کام کو پنڈنگ رکھنے کی عادت کی طرف ہماری توجہ

مبذول کرائی ہے تو دوسری طرف ان کے تھرو پراپر چینل کام کرنے پر بڑا ہی عمدہ مزاحیہ پہلو نکالا ہے:

''اگر گھر میں ان کا سب سے پہلے چھوٹا بچہ شرارت کرتا ہے تو اسے تھرو پراپر چینل مارنے کے لیے سب سے پہلے وہ اپنی بیوی کو ڈانٹتے ہیں پھر بڑے لڑکے کو اور علی الترتیب اپنی ساری اولادوں کے گالوں پر طمانچے رسید کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بچے کے گال تک پہنچتے ہیں''۔ ۶۹

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں جس میں ایک افسانہ نگار جو پیشے سے پوسٹ مین ہے' اپنے افسانے میں اس طرح کے جملے لکھتا نظر آتا ہے:

''اور نجمہ اپنے بچوں کو ایک کونے میں ڈھکیل کر یوں پیٹنے لگی جیسے کوئی پوسٹ مین خطوں پر مہریں لگا رہا ہو' نجمہ کا شوہر خالد دور کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا مگر وہ نجمہ کے آگے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا... اس کی حیثیت تو ایک بیرنگ لفافے کی سی تھی' جو پیسے دے' اس کو وہی حاصل کر لے۔ نجمہ کے یہاں گزشتہ مہینے ہی ڈیلیوری ہوئی تھی۔ خالد ان ایکسپریس ڈیلیوریوں سے تنگ آچکا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں اس کے دل کے نہاں خانے میں یوں دبی پڑی تھیں جیسے 'ڈیڈ لیٹر آفس' میں خطوط پڑے رہتے ہیں' خالد سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ لیٹر باکس کی طرح سرخ ہونے لگا پھر اس نے حواس درست کئے اور ہمت سے بولا ''نجمہ اگر تم میرے بچوں کو اسی طرح پیٹتی ہیں تو میں تمہیں تمہارے میکے کو ری ڈائریکٹ' کردوں گا''۔ ۷۰

مجتبیٰ حسین نے انگریزی الفاظ سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً سائیکل کو سیکل لکھ دیا' کیلکولیٹر کو کیا لکولیٹر' کیلیبر کو کیا لیبر وغیرہ۔ جسے قاری پہلی نظر میں کتابت کی غلطی تصور کر کے آگے بڑھ جاتا ہے لیکن تھوڑے غور کے بعد اسے یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے لفظوں کے ہجے (Pronuciation) سے بھی مزاح پیدا کر دیا ہے۔ یعنی مذکر الفاظ کو مونث استعمال کر کے اپنی شوخی وجودتِ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ ''قصہ مختصر'' کا ایک مضمون ''ہوٹل شبانہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں انہوں نے ہوٹل کو شروع سے آخر تک مذکر کے

بدلے مؤنث استعمال کیا ہے جس سے ایک عجیب سی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے جو قاری کو گدگدانے کے لیے کافی ہے:

''مخدوم چلے گئے' جامیؔ رخصت ہو گئے' اریبؔ چل بسے' لے دے کے ایک ہوٹل شبانہ رہ گئی تھی سو وہ بھی ہمارے درمیان سے اٹھ گئی''۱۷

''ہوٹل شبانہ کی خوبی یہ تھی کہ یہ علم و ادب' سیاست و تہذیب کی گہوارہ تھی''۲۷

محمد حسین آزادؔ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف میں ظرافت کی تین خوبیاں گنائی ہیں۔شوخی' ظرافت اور مبالغہ' مجتبیٰ حسین کو ان تینوں ہی خوبیوں پر انتہائی قدرت حاصل ہے۔علاوہ ازیں وہ فقرہ بازی' لطیفہ گوئی اور لطیفہ سازی میں بھی مہارت رکھتے ہیں جو ان کی جودتِ طبع کا مرہون منّت ہے۔وہ بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین پڑھتے وقت یہ خیال اُبھرتا ہے کہ وہ موضوع سے بھٹکتے جا رہے ہیں لیکن اچانک ہی وہ ان ضمنی جملوں کو اتنی خوب صورتی سے موضوع کے موافق بنا دیتے ہیں کہ ہمیں ان کی فن کاری کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔کبھی کبھی جب وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو صاف گوئی کا سہارا لیتے ہیں اور بہ بانگ دُہل یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ تو ضمنی باتیں تھیں۔آیئے اب موضوع پر آتے ہیں۔باتیں بنانا تو کوئی ان سے سیکھے کیوں کہ یہ ان کے اسلوب کا ایسا وصف ہے جس سے وہ اکثر بات بنا لے جاتے ہیں اور خیال کی رو شعور کی گرفت میں رہتی ہے۔وہ کسی بات کو لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے بالواسطہ پیرایوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔تخلیقی اظہار کی خوبی بھی یہی ہے کہ ایسے پیرایوں کو استعمال کیا جائے جس سے کفایت لفظی اور معنی آفرینی دونوں فائدے حاصل ہو سکیں اور اظہار میں شائستگی بھی برقرار رہے۔اسی لیے وہ اپنے مزاحیہ مضامین میں کنایاتی اسلوب اختیار کرتے ہیں جس میں رمز و ایماء کے ذریعے بات کہی جا سکے اور انہیں اپنی جودتِ طبع اور اختراعی ذہن کا ثبوت فراہم کرنے کے وافر مواقع میسر ہو سکیں۔پیش ہے چند مثالیں:

''ہم نے عید کے دن ایک گوالے کو دیکھا جو بالٹیوں میں پانی بھر کر لے جا رہا تھا۔ہم نے پوچھا' یہ کیا ہو رہا ہے وہ بولا جی کچھ نہیں' ذرا عید کی تیاری ہو رہی ہے''۳۷

''ایک مژدۂ جاں فزا ملا کہ 'تناظر' کا کاتب کہیں غائب ہوگیا ہے۔
بعض کاتب اس طرح ادب کی بڑی خدمت انجام دیتے ہیں''۔ ۷۴

''یہاں کے فسادات اتنے خالص ہوتے ہیں کہ ان میں کہیں بھی
انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہوتی''۔ ۷۵

ناقدین ادب کا یہ خیال حد درجہ درست ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ ادب ایسا ادب ہے جس میں مقصدیت اور افادیت دونوں ہی حاصل کرنے کے وافر مواقع میسر ہوتے ہیں جسے طنز و مزاح نگار اپنے عمیق مشاہدے سے محسوس کر کے اور عقابی نظروں سے دیکھ کر قلم کی زد میں لاتا ہے مثلاً اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ لائبریریاں علوم و فنون کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہوتی ہیں، جہاں طالبانِ علم اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ لیکن اس بات پر شاید ہی کسی کی نظر جاتی ہے کہ فٹ پاتھوں اور بلند عمارتوں کے سائے میں غریب اور مفلوک الحال لوگ کس طرح پناہ لیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح لائبریری کو بھی مختلف طبقے کے لوگ ہوٹل، ڈرائنگ روم، معشوقہ سے ملاقات کی جگہ اور کبھی کبھی تو اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے ہیں۔ پیش ہے اگلا اقتباس جس میں مجتبیٰ حسین نے اسی قسم کے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو ان کی انفرادیت کا بین ثبوت ہے:

''میں ایک ناظر سے واقف ہوں جو صرف موسم برسات میں بڑی
پابندی سے لائبریری آتے ہیں۔ میں نے پورے ادب و احترام سے پوچھا
!اجی حضرت یہ کیا بات ہے کہ آپ صرف برسات میں مطالعہ کی طرف
راغب ہوتے ہیں۔ اس پر وہ یخ بستہ آہ کھینچتے ہوئے بولے ''بھائی بات
دراصل یہ ہے کہ اس موسم میں میرے مکان کی چھت بہت ٹپکتی ہے۔
لائبریری کی چھت نہیں ٹپکتی' اس لیے برسات میں مطالعہ کی طرف راغب
ہوتا ہوں''۔ ۷۶

موصوف بلا کے ذہین اور بے باک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا قلم بے باکی، روانی اور برجستگی لئے ہوئے ہے جس سے وہ تیکھے طنز اور لطیف مزاح میں ایک خوب صورت امتزاج پیدا کر دیتے ہیں جس کی کئی جھلکیاں لائبریری والے مضمون میں دیکھی جا سکتی ہیں جس میں انہوں نے خود ہی اپنے مشاہدے کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''میں ناظرین کے چہروں کو پڑھنے کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ دور سے ہی ناظر کے چہرے کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ وہ کون سی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اگر کوئی دیر سے اونگھ رہا ہے تو سمجھئے کہ وہ فلسفے کی کتاب پڑھ رہا ہے' اگر کوئی قاری تھوڑی دیر اونگھ رہا ہے' تھوڑی دیر جاگ رہا ہو تو جانئے وہ معاشیات کی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اگر قاری پر رِقت طاری ہو جیسے اس نے کاسٹر آئل پی رکھا ہو تو سمجھئے کہ وہ ضرور کوئی المیہ ناول پڑھ رہا ہے۔ اگر قاری کے چہرے پر وحشت برس رہی ہو تو جانئے کہ وہ ضرور کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہا ہے''۔ ۷۷

یقیناً ''تکلف برطرف'' سے ''آخرکار'' تک کے اگر مجموعی مزاحیہ مضامین کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو ان سبھی میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کے موضوعات میں وسعت و تنوع ہے جس میں ایک ہیرو تقریباً ہر جگہ موجود ہے' مختلف شکلوں میں' مختلف روپوں اور مختلف لبادوں میں' لیکن ان کی باطنی ہیئت میں کوئی تضاد نہیں مثلاً انتخابی نعرے' مرزا کی یادمیں' ہوٹل شبانہ' یہ کلنڈر جمع کرنے والے' مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ وغیرہ میں وہ مصنف کے دوست مرزا کی صورت میں سامنے آتا ہے جو ایک کلرک ہے اور جس کی زندگی کے دردناک حادثات اس کے چہرے پر پڑھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح دیگر مضامین مثلاً کالونی میں رہنا' نوکری کی تلاش میں' قصہء گریجویٹ درویش کا' مہمان وغیرہ میں خود مزاح نگار کی سیرت کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے جو ان کے فن کو جلا بخشتی ہے اور ہمیں تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ غور وفکر کی دعوت دینے میں بھی کامیاب ہے۔ شاید اسی لیے ان کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم حنفی رقم طراز ہیں:

''مجتبیٰ حسین طنز سے بہت کم واسطہ رکھتے ہیں اور ان کا مزاح اپنے اندر عمومی دلچسپی رکھنے کے باوصف خواص کو بھی متوجہ کرتا ہے۔ الفاظ کے گھماؤ پھراؤ' لطیفوں کی کاٹ چھانٹ کے بعد انہیں موضوع سے ہم آہنگ کرنے اور واقعات کی تمسخر آمیز پیش کش کے ذریعے مجتبیٰ حسین مزاحیہ صورت حال پیش کرتے ہیں۔ اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے''۔ ۷۸

☆☆☆

حواشی

مصنف	کتاب	ناشر	صفحہ
۱۔وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح۔ایجوکیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۹۰ء		۶۲
۲۔مجتبیٰ حسین	تکلف برطرف	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۶ء	۵۶
۳۔رشید احمد صدیقی	طنزیات و مضحکات	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۳ء	۲۶
۴۔فیلڈنگ	دیباچہ	جوزف اینڈریو --------	
۵۔نارمن فرلانگ	دیباچہ	English satire	
۶۔ہیری شا	Dictionary of literary terms	McGraw Hill Book company,NEwyork1992	۳۳۲
۷۔East Man	Enfoyment of laughter		۱۹
۸۔Stephen Lecock	Humour and Humanity		۱۱
۹۔پنڈت دتاتریہ کیفی	کیفیہ بحوالہ طنز و مزاح نمبر نقوش		۳۵
۱۰۔بحوالہ	نیا دور (یادرفتگاں نمبر) لکھنو مارچ۔دسمبر ۱۹۸۸ء		۱۸۷
۱۱۔ہیری شا	Dictionary of literary terms	McGraw Hill Book company,New York19992	۱۸۸
۱۲۔احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	ادارہ فروغ ادب لکھنو ۱۹۷۷ء	
۱۳۔کلیم الدین احمد	سخن ہائے گفتنی	کتاب منزل پٹنہ ۱۹۲۷ء	۳۱۲
۱۴۔محمد علی صدیقی	ہم سخن طنز و مزاح نمبر		۳۸
۱۵۔ڈاکٹر وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڈھ ۱۹۹۰ء		۵۰
۱۶۔پروفیسر انجم اعظمی	ہم سخن طنز و مزاح نمبر ۸۲۔۱۹۸۳ء		۳۳
۱۷۔ڈاکٹر وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڈھ ۱۹۹۰ء		۳۳
۱۸۔نثار احمد فاروقی	بحوالہ آج کل	(طنز و مزاح نمبر جلد دوم) نئی دہلی، مئی ۱۹۷۴ء	۳
۱۹۔آل احمد سرور	تنقید کیا ہے۔	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ۱۹۸۲ء	۵۴
۲۰۔مجتبیٰ حسین	قصہ مختصر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۳ء	۱۵-۱۴
۲۱۔ایضاً	تکلف برطرف	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء	۱۳-۱۲
۲۲۔ایضاً	قطع کلام	ایضاً ایضاً ۱۹۶۹ء	۹-۸

۲۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۳۸
۲۴۔ایضاً	بالآخر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۲ء			۳۳
۲۵۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۸۔۴۹
۲۶۔محی الدین قادری زور	اردو اسالیب بیان				۱۵۲
۲۷۔ڈاکٹر امیر اللہ شاہین	اردو اسالیب نثر۔تاریخ و تجزیہ				۵۸
۲۸۔علی رفاد فتیحی	اسلوبیاتی تنقید				۱۳۲
۲۹۔جارج لوئس بوفان	بحوالہ تنقیدی اصول اور نظریہ				۱۲۹
۳۰۔پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی	تنقیدی نظریات				۲۰۲
۳۱۔مجتبیٰ حسین	بہرحال	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۴ء			۵۵
۳۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶۱۔۶۲
۳۳۔مجتبیٰ حسین	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو ۱۹۶۹ء			۱۷
۳۴۔شگوفہ جلد ۲۰	مجتبیٰ حسین نمبر	حیدرآباد ۱۹۸۷ء			۴۲
۳۵۔مجتبیٰ حسین	تکلف برطرف	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء			۹۹۔۱۰۰
۳۶۔مجتبیٰ حسین	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۹ء			۱۲۶
۳۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶۶
۳۸۔ایضاً	قصہ مختصر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۲ء			۴۸
۳۹۔ایضاً	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۹ء			۶۳
۴۰۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۷۳
۴۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۷۴
۴۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۷۵
۴۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۹
۴۴۔مظہر امام	مجتبیٰ حسین کی سفر نامہ نگاری	سوئنر جشن مجتبیٰ شارجہ دبئی' ۱۹۹۷			
۴۵۔ایضاً	ایضاً		ایضاً	ایضاً	
۴۶۔مجتبیٰ حسین	بالآخر	حسامی بک ڈپو ۱۹۸۲ء			۳۸
۴۷۔مجتبیٰ حسین	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۹ء			۶۴
۴۸۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۸۱
۴۹۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۸
۵۰۔مجتبیٰ حسین	قصہ مختصر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۲ء			۷۴

۵۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۳۶
۵۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۷۱
۵۳۔ایضاً	الغرض	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۷۵۔۷۴
۵۴۔ایضاً	بالآخر	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۳	۱۷
۵۵۔مجتبیٰ حسین	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۹ء			۳۳
۵۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۲۵
۵۷۔ایضاً	آخرکار	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۱
۵۸۔ایضاً	تکلف برطرف	حسامی بک ڈپو ۱۹۶۸ء			۴۴
۵۹۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۵۵
۶۰۔مجتبیٰ حسین	آخرکار	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۹ء			۱۱
۶۱۔ایضاً	قطع کلام	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۳۸
۶۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۰۱۔۱۰۰
۶۳۔ایضاً	بالآخر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۲ء			۳۰
۶۴۔ایضاً	تکلف برطرف	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۰۹۔۱۰۸
۶۵۔ایضاً	بہرحال	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۴ء	۲۰
۶۶۔ایضاً	تکلف برطرف	ایضاً	ایضاً	۱۹۶۸ء	۵۷
۶۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۵۷
۶۸۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۱۰
۶۹۔مجتبیٰ حسین	قصہ مختصر	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۳ء	۳۵
۷۰۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۳۵
۷۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۸۶
۷۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً		۸۱
۷۳۔ایضاً	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۹ء			۱۲۶
۷۴۔ایضاً	بالآخر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۲ء			۱۰۵
۷۵۔ایضاً	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء			۶۴
۷۶۔ایضاً	تکلف برطرف	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۶۸ء			۹۵
۷۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۹۷۔۹۶
۷۸۔ڈاکٹر شمیم حنفی	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح اردو اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۹۰ء				۲۵

مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری: ایک تجزیہ

ادب میں خاکے سے عام طور پر کوئی ایسی تحریر مراد لی جاتی ہے کہ جو بجائے بھرپور تاثر کے ایک ابتدائی تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے اور جس میں ادیب کا عمل غیر رسمی اور بے تکلفانہ ہو اور اس نے خاکہ میں پیشہ ورانہ سنجیدگی سے بھی پرہیز کیا ہو۔ یعنی خاکے کا لفظ کسی ایسی تحریر کے لیے مستعمل ہے جو سرسری نوعیت کا حامل ہو، بہ ظاہر اس میں نہ تو خیال و معنی کے بے شمار نشیب و فراز ہوں اور نہ ہی ڈرامے یا افسانے کی گہرائی پھیلاؤ اور تاثر وغیرہ بلکہ اس میں کسی شخص کی جیتی جاگتی اور حقیقی تصویر دکھائی دے۔ خاکے عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں۔ سوانحی خاکہ اور افسانوی خاکہ۔

سوانحی خاکے ایسے خاکے ہیں جو کسی حقیقی شخصیت کے کردار کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہوتے ہیں جب کہ افسانوی خاکے ایسے خاکے ہیں جو کسی تخلیقی کردار کی خصوصی کیفیت کو واضح کرتے ہیں۔ یعنی خاکہ نگاری کی سرحدیں ایک طرف تو سوانح نگاری سے جا ملتی ہیں تو دوسری طرف افسانہ نگاری سے۔ چناں چہ ایک اچھا خاکہ نویس سوانح اور افسانے کی بیچوں بیچ رہ کر کئی چھوٹی چھوٹی کیفیات سے مرتب زندگی کا رنگارنگ اور پہلو دار نقش پیش کرتا ہے۔ خاکہ کا اسلوب انشائیے سے قریب تر ہوتا ہے جس میں مصنف کی شخصی دلچسپی اور اس کے تاثرات و قیاسات کے علاوہ توصیف کا رنگ، تعجب کا احساس، رحم اور ہمدردی کے جذبات، طنز کے نشتر اور مزاح کی پھلجھڑیاں سبھی کچھ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ڈاکٹر صابرہ سعید نے خاکہ نگاری کے متعلق

اظہار خیال کرتے ہوئے اسے اشاروں کا آرٹ گردانا ہے۔ وہ اپنی تصنیف ''اُردو میں خاکہ نگاری'' میں رقم طراز ہیں کہ

''بعض اصناف فنی اعتبار سے تو بظاہر بہت سادہ نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں بہت پیچیدہ ہوتی ہیں۔ خاکہ نگاری بھی ایسی ہی صنف ہے۔ اس کو اشاروں کا آرٹ بھی کہا گیا ہے' صفحہ۔[1]

چناں چہ صابرہ سعید کا یہ کہنا ہے کہ جس طرح اصناف نظم میں غزل کے فن کو دشوار سمجھا جاتا ہے' اسی کے مثل نثر میں فن خاکہ نگاری پیچیدہ ہے۔ خاکے مختصر بھی ہو سکتے ہیں اور طویل بھی۔ حالاں کہ خاکوں میں خاکہ نگار تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیتا ہے لیکن کمال فن تو یہ ہے کہ کسی مختصر خاکے میں شخصیت کے مجموعی گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈال دی جائے یعنی کوزے میں دریا کو بند کر دیا جائے جس پر مجتبیٰ حسین نہایت قادر نظر آتے ہیں۔ اور یہی مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی سب سے وقیع خصوصیت بھی ہے کہ وہ چند صفحات میں ہی اپنے خاکوں میں شخصیت کی مکمل عکاسی کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا کوئی بھی خاکہ پانچ چھ صفحات سے زیادہ طویل نہیں ہوتا جسے ایک نشست میں نہیں بلکہ چند منٹوں میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کی اس تعریف پر کھرے اترتے ہیں جس میں انہوں نے خاکہ نگاری کو شخصیت کی عکاسی کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خاکہ دراصل شخصیت کی عکاسی کا نام ہے اور اچھا خاکہ دراصل شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے''[2]

فنی نقطۂ نظر سے بھی مزاحیہ خاکہ نگاری ایسی صنفِ نثر ہے جس میں کسی شخص کے ظاہری و باطنی تمام پہلوؤں سے قاری کو متعارف کرانے کی شعوری کوشش کارفرما ہوتی ہے جس میں متعلقہ شخص کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی سے پردہ اٹھایا جاتا ہے نہ کہ اس شخص کے کسی کمزور پہلو کو اُجاگر کر کے نیچا دکھانے یا حقیر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر اس کی کسی خوبی کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ایک عام انسان نہ رہ جائے یعنی خاکہ نگاری بُت گری کے ایسے زمرے میں آتا ہے جس کے ذریعے کسی شخص کی صورت و سیرت دونوں کو اجاگر کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کے اس بیان سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ:

''اچھا خاکہ وہ ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور افکار دونوں کی

جھلک ہو۔ خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت، سیرت، مزاج، اس کے ذہن کی افتاد، اس کا زاویۂ فکر، اس کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آجائیں۔ شاعری میں مبالغہ ہوسکتا ہے، نثر میں عبارت آرائی کی تخیل کی آمیزش ہوسکتی ہے لیکن خاکہ ایک ایسی صنف ہے جس میں رو رعایت ہو یا مبالغہ اور مدح سرائی ہو تو وہ پھر خاکہ نہیں رہتا''۔[۳]

خاکہ نگاری کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم رقم طراز ہیں:

''خاکہ نگاری ایک مشکل اور نازک فن ہے۔ اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا جس طرح غزل میں محدود الفاظ میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح خاکے میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔ کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے خوب صورت مورتی کس طرح تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب دیا مورتی تو خود اس پتھر میں موجود تھی، میں نے تو صرف زائد حصہ کو علاحدہ کیا ہے۔ بالکل یہی کام خاکہ نگار کا ہوتا ہے۔ وہ سوانح عمری سے زائد حصہ کو اس طرح الگ کر دیتا ہے کہ شخصیت اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے''۔[۴]

مندرجہ بالا تعریفوں سے ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ایک اچھے خاکہ نگار کو غیر جانب دار رہنا چاہئے کیوں کہ ادب میں اچھا خاکہ وہی تصور کیا جاتا ہے جس میں خاکہ نگار کسی شخص کی خوبیوں اور خامیوں دونوں ہی کا بھرپور اظہار کرے کیوں کہ اگر کوئی خاکہ نگار خاکہ لکھتے وقت صرف اچھائیاں ہی بیان کرتا رہے تو اسے خاکے کا نام نہ دے کر قصیدہ خوانی کا نام دیا جانے لگے گا جو خاکہ نگاری کے فن کو مجروح کر دے گا۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے نمائندہ وصف آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں کیوں کہ وہ ہمیں اپنے خاکوں کے شخص کی خوبیوں، خامیوں یہاں تک کہ آداب و اطوار، رہن سہن، چہرہ بشرہ، سبھی کچھ سے آگاہ کرا دیتے ہیں جو ایک اچھے خاکہ نگار کی بہت بڑی خوبی ہے۔ ڈاکٹر اشرف رفیع نے بھی خاکہ نگاری کے متعلق کچھ اسی قسم کے خیالات پیش کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''غزل گوئی کی طرح خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ غزل کہنے کی کوشش میں ذرا سی بے احتیاطی اچھے خاصے شاعر کو مرثیہ گو بنا دیتی ہے اور ذرا سی لغزش ایک خاکہ نگار پر صحافی یا سوانحی مضمون نگار کا لیبل لگا دیتی ہے''۔[۵]

مندرجہ بالا تفصیلات کو ملحوظ رکھ کر اگر مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بھی اس فن پر کھرے اُتریں گے اور ان کے خاکے صحافتی پروفائل یا سوانحی مضمون کی صف میں شامل ہونے سے عاری نظر آئیں گے۔ دراصل وہ خاکوں میں ایک سنگ تراش کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں یعنی ان کے خاکوں میں جو تصویر جھلکتی ہے' وہ بعینہ ویسی نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے نہایت خوب صورتی سے تراش خراش کر ہمارے سامنے ایک مجسمے کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو ان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اُردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' میں جا بجا موجود ہیں اور اس کے بعد لکھے گئے تقریباً سبھی تذکروں میں بھی خاکہ نگاری کے عناصر بکھرے پڑے ہیں۔ تذکروں اور ادبی تاریخوں کے علاوہ سوانحی کتابوں مثلاً یادگارِ غالب' حیاتِ جاوید' حیاتِ سعدی' سیرۃ النبیؐ' الفاروق' المامون اور سیرۃ النعمان وغیرہ میں بھی خاکہ نگاری کے نمونے کہیں روشن اور کہیں دھندلی شکل میں مل جاتے ہیں۔ لیکن اس صنف کو شہرۂ آفاق بنانے میں فرحت اللہ بیگ ہی سرفہرست ہیں جن کی تصنیف ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' خاکہ نگاری کا نقش اول ہے۔ فرحت اللہ بیگ اپنی اس سعی سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ''خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق کا۔ انہوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا' خواہ کوئی برا مانے یا بھلا جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا' وہیں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تا کہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے''۔[6]

اس عبارت سے ایک بات بہ خوبی آشکارا ہوتی ہے کہ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھنے میں غیر جانب داری سے کام لیا ہے اور یہی ایک خاکے کو بہترین خاکہ قرار دیئے جانے کے لیے ضروری بھی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فرحت اللہ بیگ ہی اردو کے پہلے خاکہ نگار ہیں جنہوں نے خاکہ نگاری کے نمائندہ اصول مرتب کئے اور اس پر کاربند بھی رہے چہ جائیکہ انہوں نے اپنے محترم بزرگ ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا خاکہ لکھا جہاں ادبی دیانت داری

میں لغزش کے حد درجہ امکانات تھے لیکن انہوں نے اپنے فن کو اہمیت دی اور قاری کے لیے ایسا خاکہ لکھنے میں کامیاب رہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے بعد خاکہ نگاری میں دوسرا سب سے اہم نام مولوی عبدالحق کا ہے۔ بہ طور ثبوت ہم ان کی تصنیف ''چند ہم عصر'' کو پیش کر سکتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کا خاکہ لکھا ہے۔ بے شک خاکے تو ہر خاکہ نگار لکھتا ہے لیکن گدڑی کا لال اور نور خاں مالی جیسے خاکے لکھ کر مولوی عبدالحق نے اُردو خاکہ نگاری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ پیش ہے ایک مثال جس سے ان کے فن کی ایک ہلکی جھلک سے آپ بھی روشناس ہو جائیں گے۔ وہ مولوی وحیدالدین کے خاکے میں رقم طراز ہیں:

> ''مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے زیادہ تجاوز کر جاتے تھے مگر بڑی سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا''۔ ۷

فن خاکہ نگاری سے بحث کی جائے اور رشید احمد صدیقی کا ذکر نہ آئے، یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ ان کی شخصیت مرقع نگاری میں بھی مسلم ہے۔ رشید صاحب کی تصنیف مضامین رشید، خنداں، ہم نفسانِ رفتاں اور گنج ہائے گرانمایہ میں ہمیں بہت ہی اچھے خاکے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں گنج ہائے گرانمایہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ رشید احمد صدیقی نے مذکورہ کتاب میں بعض مشاہیر کے آداب و اطوار کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ شخصیتیں اردو ادب میں زندہ جاوید بن گئیں ہیں۔ ان کے خاکوں میں بھی ہمیں خاکہ نگاری کے تمام لوازم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پیش ہے محمد ایوب عباسی کے خاکے سے ایک چھوٹا سا اقتباس، جس سے آپ بھی ان کی خاکہ نگاری کے قائل ہو جائیں گے:

> ''ان میں بہ ظاہر کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، وہ عالم و فاضل نہ تھے، دولت مند نہ تھے، ایسے طباع اور ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انہیں جوڑ توڑ آتا تھا، نہ خوش پوشاک نہ خوش گفتار، نہ خوش باش نہ رنگین و رعنا، وہ معمولی آدمیوں میں سے بھی کچھ معمولی تھے۔ پھر شاعر ایسے تھے کہ ہم میں ویسا کوئی نہیں اور اب سے آگے بھی شاید کوئی ایسا ملے''۔ ۸

ملاحظہ فرمایا آپ نے رشید صاحب نے کس خوبی سے فرد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے محمد ایوب کی اچھائیوں اور برائیوں کو قاری کے سامنے نہایت کامیابی سے پیش کر دیا۔ نچلے اور متوسط طبقے کے انسانوں کے خاکے صرف مولوی عبدالحق نے ہی تحریر نہیں کئے ہیں بلکہ اس میدان میں رشید صاحب بھی پیش پیش ہیں۔ انہوں نے بھی ان لوگوں کے خاکے تحریر کئے ہیں جن کی سماج میں بہت زیادہ قدر و منزلت نہیں تھی مثلاً انہوں نے ایک غریب و نادار چپراسی کندن کا خاکہ لکھ کر اس کے عادات واطوار اور ذمہ داریوں وغیرہ کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے کہ وہ ادب پارہ بن گیا اور آج بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ پیش ہے چند سطریں جن سے آپ رشید صاحب کے فن کو محسوس کر سکیں گے:

> ''.... کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے۔ کندن گھنٹہ بجاتا تھا' معلوم نہیں کب سے کم وبیش تیس پینتیس سال سے۔ اتنے دنوں سے پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آ جائے گا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجاتا رہا تھا۔ اس کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدتِ ملازمت ختم کی۔ یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹہ بجاتے چھوڑا۔ گھنٹہ کی آواز روزمرہ کے اوقات میں ایسی گھل مل گئی تھی کہ جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے اندر سے آ رہی ہو جیسے وظائفِ جسمانی کے معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ کئی دنوں کے بعد کسی نے بتایا کہ کندن مر گیا۔ ایک دھچکہ سا لگا۔ ارے کندن مر گیا! اتنے دنوں تک گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے''۔[9]

یقیناً رشید احمد صدیقی نے کندن کا خاکہ لکھ کر فن خاکہ نگاری میں گراں قدر اضافہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ صنف خاکہ نگاری کو وقار و عظمت بخشا ہے اس لیے کہ اعلا طبقے کے افراد اور اعلا سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد کا خاکہ تو تقریباً تمام خاکہ نگار لکھتے ہیں بلکہ بہت سارے لوگ تو ذاتی مفاد کی خاطر خاکہ لکھا کرتے ہیں لیکن کسی غریب و نادار کو اپنا موضوع بنانا نہ صرف بڑا کام ہے بلکہ کشادہ ذہن اور فراخ دل ہونے کی علامت بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رشید صاحب نے دونوں ہی طبقوں کو برابر اہمیت دی اور اپنی تخلیقات کے ذریعے ہی کندن جیسے نہ

جانے کتنے غریب و نادار کو حیاتِ جاودانی عطا کردی ہے بلکہ اپنی اعلا ظرفی کا لوہا بھی منوالیا ہے۔

آج خاکہ نگاری کا سلسلہ خواجہ حسن نظامی، عبدالرزاق کان پوری، آغا حیدر حسن دہلوی، راشد الخیری، عبدالماجد دریا آبادی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، جوش ملیح آبادی، شاہد احمد دہلوی، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، رشید احمد صدیقی، احمد جمال پاشا، فکر تونسوی، ضمیر جعفری، مشتاق احمد یوسفی، شورش کاشمیری، اشرف صبوحی، سردار دیوان سنگھ مفتون، خواجہ محمد شفیع، مرزا محمود بیگ، سید اعجاز حسین، فرقت کاکوروی، بیگم انیس قدوائی، انتظار حسین، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت وغیرہ تک پہنچ گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سبھی نے حتی المقدور اپنے اپنے طور پر اس صنف کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا اور فکر و نظر کے نئے نئے زاویوں سے شخصیت کی پرکھ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس صنف کو وقار و اعتبار بخشا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی مجتبیٰ حسین بھی ہیں، جنہوں نے اپنا ادبی سفر کالموں سے شروع کیا تھا لیکن آج وہ ہندوستان کے خاکہ نگاروں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اب تک ان کے خاکوں کے چار مجموعے ''سو ہے وہ بھی آدمی'' (۱۹۸۷) ''آدمی نامہ'' (۱۹۸۱) ''چہرہ در چہرہ'' (۱۹۹۳ء) اور 'ہوئے ہم دوست جس کے' ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آکر اپنی معنویت ثابت کرچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ذریعے تحریر کردہ کئی خاکے مضامین کے مجموعے ''تکلف برطرف''، ''بہر حال''، ''قصہ مختصر''، ''قطع کلام'' میں بھی شامل ہیں اور ہمیں اس بات کا احساس دلانے میں کامیاب ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے پیش رووں کی روایت کو آگے بڑھانے میں پیش پیش ہیں بلکہ اس میں نئے گوشوں کا اضافہ بھی کرنے میں کامیاب ہیں جس سے قاری کی تسکین کا سامان بہم ہوسکے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تمام خاکوں میں اس شخص کی زندگی کے اچھے برے سبھی پہلوؤں کو قاری کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ موصوف اس شخص کی بے جا تعریف کرکے نہ اسے فرشتہ ٹھہراتے ہیں اور نہ ہی تنقیص کے ذریعہ اسے ولن (Villain) کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ انسان کو انسان کی شکل میں ہی پیش کرتے ہیں جس سے اس شخص کا اصلی روپ ہمارے سامنے آسکے۔ انہیں اس بات کا بہ خوبی علم ہے کہ ایک خاکہ نگار کا کام بت گری یا بت شکنی نہیں ہے۔

مجتبیٰ حسین نے انہیں لوگوں کے خاکے لکھے ہیں جن سے وہ بہ خوبی واقف تھے یا ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ اس شخص کے حیات اور کارنامے نہیں بیان کرتے بلکہ اس شخص کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور دلچسپ واقعات کے ذریعہ ایسا پیکر تراشتے ہیں جسے انہوں نے خود دیکھا، سمجھا یا برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے پیشہ، مشاغل، دلچسپیوں وغیرہ پر بھرپور تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، خواہ وہ خاکے شاعروں، ادیبوں، مصوروں کے ہوں یا عہدیداروں اور کلرکوں کے، سبھی کے فن اور شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کی جھلک مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا خاص وصف ہے جس میں ان کے لہجے کی شگفتگی، تازگی، ندرت، جدّت اور اندازِ بیان کا ایسا جادو چھایا ہوا ہے جو سرچڑھ کر بولتا ہے۔

حکیم یوسف خاں کا خاکہ مجتبیٰ حسین کا تحریر کردہ پہلا خاکہ تھا جسے انہوں نے ان ہی کی فرمائش پر ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا اور اس وقت سے آج تک سیکڑوں خاکے لکھ چکے ہیں جن میں فرمائشی اور غیر فرمائشی دونوں قسم کے خاکے شامل ہیں لیکن ان خاکوں میں وہ خاکے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جنہیں انہوں نے اپنی اندرونی تحریک سے متاثر ہوکر لکھا ہے۔ انہیں خاکوں میں ان کا فن بھی پوری طرح بامِ عروج پر نظر آتا ہے جیسے سجاد ظہیر، عمیق حنفی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس، فدا حسین، خشونت سنگھ، مغنی تبسم وغیرہ کے خاکے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بقیہ خاکے یوں ہی لکھ دیئے گئے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے سبھی خاکے انکشافِ ذات وصفات کے عمل سے عبارت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عموماً ایسے اشخاص کو ہی اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے جو کسی نہ کسی طرح علم وفن میں ایک مخصوص مقام پر فائز ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام خاکوں میں شاید ایک بھی خاکہ ایسا نہیں ہے جس میں انہوں نے نچلے اور متوسط طبقے کے افراد کو اپنا موضوع بنایا ہو جو کہ ادب شناس قارئین کو اکثر کھٹکتا ہے لیکن اس امر سے انحراف ممکن نہیں کہ ان خاکوں میں بھی انہوں نے خاکہ نگاری کے فن کو بہ خوبی برتا ہے۔ خواہ وہ خواجہ احمد عباس ہوں، اندر کمار گجرال کا خاکہ ہو یا شہر یار، خشونت سنگھ، فدا حسین یا پھر شریف الحسن نقوی کے خاکے، سبھی خاکوں میں ان کے مزاحیہ اسلوب نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ اپنے خاکوں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا بھی ہے:

”میں نے یہ خاکے کسی کے حق میں یا خلاف بالکل نہیں لکھے ہیں۔

جس طرح دل ودماغ نے کسی شخصیت کا اثر قبول کیا' اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ خاکے میں خاکہ نگار کا زاویہ نگاہ بھی در آتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ خاکہ نگار جب کسی شخص کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے طور پر خود اپنا خاکہ بھی لکھ ڈالتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ میں نے یہ سارے خاکے خود اپنا خاکہ لکھنے کی چاٹ میں لکھے ہیں''۔ ۱۰

ان کے اس بیان کی تصدیق شگوفہ جولائی ۱۹۸۷ء کے ایک خاکے سے ہو جاتی ہے جسے انہوں نے اختر حسن صاحب پر لکھا تھا۔ اس خاکے میں وہ اختر حسن صاحب کی عمر کے سن و سال شمار کرتے کرتے اپنی عمر کا حساب بھی لگا لیتے ہیں جو خود کا خاکہ لکھنے کے مترادف ہے۔

''میں خود انہیں لگ بھگ تین دہوں سے دیکھ رہا ہوں اور ان دہوں سے پہلے کے دو دہوں میں ان کے بارے میں سنتا رہا ہوں' خود میری عمر کے پچاس برس ان کی دید و شنید میں گزر گئے لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں یقین نہیں آتا کہ اختر بھائی ۷۵ برس کے ہو گئے''۔ ۱۱

اس خاکے سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۹۵۵ء میں آرٹس کالج کی بزم اردو کے جنرل سکریٹری تھے۔ وہ محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد محکمہ اطلاعات و نشریات و تعلقات عامہ کے اُردو شعبہ میں نوکری کی وغیرہ وغیرہ۔ شاید انہیں خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر اجمل نیازی نے لکھا ہے:

''دوستوں کے خاکے لکھتے ہوئے مجتبیٰ کبھی کبھی اپنا خاکہ لکھ جاتا ہے۔ شاید وہ اپنا خاکہ لکھنے کی خواہش میں مبتلا ہے۔ بالعموم خاکہ نگار اپنی ذات کو دور نہیں ہٹا سکتا ہے۔ وہ دوسروں کو ان کے گھر تک پہنچانے کے شوق میں اپنے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ خود کو منکشف کرتا ہے' دوسروں کو افشا کرتا ہے''۔ ۱۲

مجتبیٰ حسین کا یہ اعتراف کہ دوسروں کا خاکہ لکھتے وقت خاکہ نگار کی اپنی شخصیت بھی شامل ہو جاتی ہے' بہت حد تک صحیح ہے خواہ کسی خاکہ نگار میں کم ہو یا زیادہ' زیادہ کی مثالیں ہمیں رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں دیکھنے کو ملیں گی اور کم کی مثال خود مجتبیٰ حسین کے خاکے ہیں جن

میں ایک لطیف بے ساختگی اور دل پذیری ہر جا نمایاں ہے جسے خاکہ نگاری کا پہلا وصف قرار دیا جاتا ہے۔خاکہ نگار کو اپنے آپ کو اس شخص کی شخصیت میں خود کو ضم کر لینا پڑتا ہے۔جس میں مجتبیٰ حسین کی ریاضت اور دوستی دونوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔انہوں نے بیرونی خط کشی کے سہارے شخصیت کے داخلی شبیہ کو بڑے ہی فن کارانہ انداز میں قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔جس میں ان کے ویژن اور تخلیقی صلاحیت کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں اور اس طرح اپنے خاکوں میں مجتبیٰ حسین اس شخص سے تعارف کا مکمل سامان مہیا کر دیتے ہیں اور ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اس شخص کی جسمانی ساخت' لباس' وضع قطع' اخلاق و عادات' طرز معاشرت سب کچھ ان کی گرفت میں ہے۔وہ ایک ایسے خاکہ نگار ہیں جنہیں دوسروں کی خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں اور وہ کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے بلکہ کسی عیب کی جانب قاری کی توجہ مبذول کرانا بھی مقصود ہوتا ہے تو بھی اسے اپنے مزاحیہ اسلوب سے ہنر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ان کی اسی خوبی کا اعتراف ہندوستان کے عظیم صحافی خشونت سنگھ نے ہندوستان ٹائمز' نئی دہلی میں یوں کیا ہے:

''*Mujtaba is rare among Indian Writers of humor,while he is unable to say anything unkind about others. He is equally unable to say anything in his own praise*''[۱۳]

ملاحظہ فرمائیں سعید بن محمد کے خاکے کا یہ اقتباس جوان کے اس فن پر دلالت کرتا ہے:

''وہ آرٹ کے معاملے میں بڑے دیانت دار واقع ہوئے ہیں' اتنے دیانت دار کہ سلف پورٹریٹ کو بھی سلف پورٹریٹ ہی رہنے دیتے ہیں۔وہ چاہیں تو کینوس پر قدرت سے اپنے چہرے کا انتقام لے سکتے ہیں۔کچھ نہیں تو کم از کم اپنے بالوں سے محروم سر پر چند بال اُگا ہی سکتے ہیں۔ایسا کرنے سے انہیں کون روک سکتا ہے۔اپنا پورٹریٹ اپنا برش' اپنا کینوس' اپنا رنگ اور پھر خود ہی آرٹسٹ' اتنی سہولتیں کسے ملتی ہیں۔حد تو یہ ہے کہ وہ سلف پورٹریٹ میں وہی رنگ استعمال کرتے ہیں جو ان کا اصلی رنگ ہے یعنی رات کی طرح سیاہ۔کوئی دوسرا آرٹسٹ سعید بن محمد کی جگہ ہوتا تو وہ اپنی چندیا پر چند بال اُگا لیتا' اپنی پیشانی کو جو ناک کے اوپر سے شروع ہو کر گردن تک بڑی روانی کے ساتھ مل گئی ہے۔اسے کہیں تو بریک لگا کر روک دیتا' اپنی قد آدم

تصویر بنا کر اپنے پانچ فٹ تین انچ کے قد کو چھ فٹ کر لیتا''۔۱۴

مجتبیٰ حسین کے سبھی خاکے مزاحیہ طرزِ ادا لئے ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں بھی طنز کی نشتریت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ اس شخص سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں جو ان کے خاکے کا موضوع ہوتا ہے بلکہ ان کا فن یہ ہے کہ وہ ایسا طرز تحریر اختیار کر لیتے ہیں جس سے سنجیدگی پیدا ہو جائے مگر اندر ہی اندر ایسی فضا بھی تخلیق ہوتی رہے جو اچانک کسی خوشنما پھلجھڑی کے چھوٹنے کا سماں پیش کر دے مثلاً لمبے قد کے عنوان سے کنہیا لال کپور کے متعلق یہ جملے دیکھیں:

''کنہیا لال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں، قطب مینار کی یاد آتی ہے۔ مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی ہے کہ ہوائی جہاز وغیرہ اُدھر کا رخ نہ کریں۔ کپور صاحب پر رات کے وقت یہ حفاظتی انتظام نہیں ہوتا جو خطرے سے خالی نہیں۔ کیا پتہ کسی دن کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہو جائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے''۔۱۵

مجتبیٰ حسین کے اس خاکے کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور خود کنہیا لال کپور نے بھی ان کی تعریف میں یہ جملے لکھے:

''تم نے اس خاکسار کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اتنا دل آویز ہے کہ تمہارے قلم کی بلائیں لینے کو جی چاہنے لگا ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔ بے اختیار منہ سے نکلا:

تو نے کیا یہ غضب کیا مجھ کو ہی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

''خاکہ نگاری میں تمہیں واقعی کمال حاصل ہے، خدا کرے تمہارا تخیل ہمیشہ جواں رہے''۔۱۶

مرحوم عمیق حنفی جو کہ اپنے سماجی ڈیل ڈول اور اپنے سماجی رویوں سے بھی عام انسانوں سے کچھ الگ لگتے تھے، مجتبیٰ حسین نے ان کی شخصیت کے اس پہلو میں کیسے نادر نکات پیدا کئے ہیں:

''آپ ان کے چہرے کو دیکھیں تو نہ جانے کیوں جزیرہ نمائے عرب

کا خیال آ جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داڑھی کے بغیر ان کا چہرہ عرب کے جغرافیہ سے قریب تھا اور اب داڑھی کے بعد عرب کی تاریخ وتمدن سے قریب ہو گیا''۔[17]

''عمیق حنفی'' کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہمیشہ غلط موقع پر صحیح رائے دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر لیتے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کو ایسا ملکہ حاصل ہے کہ اچھی خاصی فضا کو آن کی آن میں درہم برہم کر دیتے ہیں''۔[18]

''ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے مگر میرے لیے صرف افسانہ تھے حالاں کہ وہ میرے بڑے بھائی تھے''۔[19]

اس قسم کا انداز نریندر لوتھر' مخدوم محی الدین' سجاد ظہیر وغیرہ کے خاکوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ جس شخص کا خاکہ لکھ رہے ہوتے ہیں' اس کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی ایسا مزاحیہ پہلو تلاش کر لیتے ہیں جو بیشتر اوقات اس شخصیت کی پہچان بن جاتی ہے۔ یعنی شخصیت کی تہذیب کاری کا عمل ان کے ہر خاکے میں موجود ہے مثلاً سجاد ظہیر کا خاکہ پڑھتے وقت ہم ان کی مسکراہٹ کے وسیلے سے ان کی شخصیت کی پرکھ کرتے ہیں' جہاں مسکراہٹ بنّے بھائی کی شخصیت کی علامت بن کر اُبھرتی ہے' جسے مجتبیٰ حسین نے معنیٰ خیز امیج کی شکل میں اُبھارا ہے اور اسی امیج کے ذریعے انہوں نے بنّے بھائی کی شخصیت کی مختلف جہتوں کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:

''اگر ان کے پاس دلوں میں اُتر جانے والی مسکراہٹ نہ ہوتی تو شاید بنّے بھائی اتنی بڑی تحریک نہ چلاتے''۔[20]

''جب جب بنّے بھائی مسکرا دیتے تھے تو ان کی تقریر میں بڑی جان پیدا ہو جاتی تھی۔ اس دن پہلی بار احساس ہوا کہ بعض مسکراہٹیں اپنے اندر تحریر وتقریر سے کہیں زیادہ اظہار کی صلاحیت رکھتی ہیں''۔[21]

''بنّے بھائی کی مسکراہٹ کی خوبی یہ تھی کہ اس کے بے شمار پہلو اور بے شمار رنگ تھے۔ ایسا تنوع تھا کہ ہر بار ان کی مسکراہٹ پچھلی مسکراہٹوں سے الگ معلوم ہوتی تھی۔ کبھی یہ مسکراہٹ معصومیت کا لباس پہن لیتی' کبھی یہ

سراسر شفقت بن جاتی، کبھی محبت، کبھی عزم، کبھی حوصلہ، کبھی نرمی، کبھی یہ شائستگی، کبھی عقیدہ، کبھی طنز اور کبھی کبھی تو یہ مسکراہٹ سراسر درد و کرب تک کا روپ دھارن کر لیتی تھی،،[۲۲]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سجاد ظہیر کے خاکے میں مسکراہٹ حسی سچائی کے ساتھ ایک ایسا تجربہ بن جاتی ہے جس کے ارتعاشات کو ہم مختلف سطحوں پر محسوس کرنے لگتے ہیں جس میں مسکراہٹ نے شخصیت کے ظاہری اور باطنی دونوں رشتوں کو سمجھایا ہے اور اس کے حُسن کو جاننے اور پہچاننے میں مدد کی ہے۔

مجتبیٰ حسین کا فن اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے بنے بھائی کی شخصیت کو اس طرح نکھارا ہے کہ ہم اسے محسوس کرنے لگتے ہیں اور ہم ان خیالات و احساسات سے دوچار ہوتے ہیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں اور ان خیالات و احساسات سے بھی جو کچھ وہ نہیں کہہ پاتے۔ دراصل یہ احساساتی اسلوب کا خوب صورت نمونہ ہے جس میں مسکراہٹ ایک نشان بن کر اُبھرتی ہے اور آخر آخر تک ہم اس مسکراہٹ کے سحر میں کھوئے رہتے ہیں۔ دیکھیں یہ اقتباس جس سے مندرجہ بالا نکات مزید واضح ہو جائیں گے۔

''جب میں ان کی نعش کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ پھولوں کے ڈھیر میں ان کے ہونٹ تب بھی مسکرا رہے تھے۔ موت نے بنے بھائی کا سب کچھ چھین لیا تھا لیکن ان کی مسکراہٹ موت کی زد سے پرے تھی۔ یہ بڑی عجیب و غریب مسکراہٹ تھی۔ بڑی اٹل، اٹوٹ، مستحکم، عزم والی اور راسخ العقیدہ مسکراہٹ جیسے یہ مسکراہٹ بنے بھائی کی ساری زندگی کا نچوڑ تھی۔ ان کا عقیدہ اور ان کا نظریہ تھی۔ میں اس حیران کن مسکراہٹ کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس مسکراہٹ کو حرف حرف پڑھنا چاہتا ہوں، یہ کیسی مسکراہٹ ہے آخر؟،،[۲۳]

اور اس طرح اس خاکے کے اختتام میں مجتبیٰ حسین اپنے منفرد ویژن اور احساساتی اسلوب کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''میں سوچنے لگا، قدیم وحشی انسان کے غیر مہذب اور بے ہنگم قہقہے سے لے کر بنے بھائی کی مسکراہٹ تک انسانی تہذیب نے جو نشیب و فراز دیکھے ہیں اور جو آگہی حاصل کی ہے، وہی آگہی اصل میں بنے بھائی کی

مسکراہٹ ہے''۔[۲۴]

مجتبیٰ حسین سلیمان اریبؔ سے کافی قریب رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اریبؔ کے خاکے میں کسی قسم کی کوئی نمائش نظر نہیں آتی بلکہ ایک ایسے رشتے کا احساس ہوتا ہے جو مجتبیٰ حسین اور اریبؔ میں تھا۔ اسی احساساتی رشتے کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے اریب کے خاکے میں اریب کا ذوق، ان کی صلاحیت، ان کی ذات کا باطنی تموج، ان کی خوبیاں، خامیاں اور کمزوریاں سبھی کے واضح اشارے یکجا کر دیئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''حیدر آباد کا کوئی مشاعرہ اریبؔ کے بغیر نہ تو کامیاب ہو سکتا تھا نہ ہی فیل ہو سکتا تھا۔ بہت کم شعراء ایسے ہوں گے جن میں بیک وقت مشاعرہ کو کامیاب بنانے اور اسے فیل کرنے کی اتنی بڑی صلاحیت موجود ہو۔ اریبؔ چاہتے تو مشاعرے کو بڑی بلندی تک لے جاتے اور کبھی بگڑ جاتے تو مشاعرے کو بچہ کے کھلونے کی مانند توڑ تاڑ کر پھینک دیتے اور بڑی معصومیت کے ساتھ ٹوٹے ہوئے مشاعرے کی طرف دیکھتے''۔[۲۵]

''اریبؔ کے ہونٹ کم مسکراتے تھے اور ان کی آنکھیں زیادہ مسکراتی تھیں''۔[۲۶]

ان کے غیر شخصی خاکوں میں ''یونیسکو کی چھتری'' اہم ہے جو ان کے مشہور سفرنامے ''جاپان چلو، جاپان چلو'' میں شامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ فقرے جو انہوں نے اپنی بیوی کو لکھے تھے:

''وہ ہمیں ٹوکیو میں ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو لکھا۔ وہ ہمیں آج ملی ہے۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں شب و روز گزارنے ہیں، اسی کے سائے میں رہنا ہے''۔[۲۷]

اپنے خط میں انہوں نے چھتری کا لفظ نہ لکھ کر غلط فہمی پیدا کر دی اور نتیجتاً بیوی سے خفگی ہو گئی اور ایک لفظ ''چھتری'' نہ لکھنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا لیکن انہوں نے چھتری کا جتنا عمدہ خاکہ کھینچا ہے اور جاپان سے جس محبت کا اظہار اس چھتری کے توسط سے کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح کا ایک خاکہ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے دفتر کا ہے ۔ پیش ہے ایک اقتباس جس میں ان کا فن پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے:

''باہر سے تو وہ بلڈنگ نظر آتی تھی مگر اندر جانے کے بعد یوں محسوس

ہوتا جیسے آپ اچانک عہدِ وسطیٰ کے کسی کھنڈر میں آ گئے ہوں۔ محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ کی اس بلڈنگ میں نہ کوئی اطلاع آ سکتی تھی اور نہ ہی جائز قسم کے تعلقات عامہ کی گنجائش تھی۔ بنانے والے نے اس بلڈنگ کو کچھ ایسی بے ترتیبی سے بنایا تھا کہ ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے بھی اجنبی سے لگتے تھے گویا ہر شخص کی انفرادیت اس بلڈنگ میں محفوظ تھی''۔ ۲۸

اسی طرح کا ایک خاکہ حیدر آباد کا بھی ہے جو ان کی جودتِ طبع کا پتہ دیتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی حب الوطنی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ شاید ان کے اسی وصف کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے وحید اختر نے لکھا ہے کہ:

''مجتبیٰ دیدہ گاہ حیدر آباد ہے اور ان کی تحریریں حیدر آبادی تہذیب' زبان اور لہجے کی سیر بین''۔ ۲۹

مجتبیٰ حسین عام زندگی میں جتنے سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں' خاکہ نگاری میں ویسے ہرگز نظر نہیں آتے بلکہ بہ حیثیت خاکہ نگار وہ بلا کے چالاک اور چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔ وہ مدح بالذم اور تنقیص نما وصف کے بے شمار گُروں سے کام لیتے ہوئے اپنے موضوع خاکہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑی بے باکی سے جُملے چسپاں کر جاتے ہیں اور بہت غور کے بعد یہ عُقدہ کھلتا ہے کہ انہوں نے کسی خوبی کو نہیں بلکہ خامی کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے اس وصف کی وجہ سے کئی لوگوں کو اس بات کا یقین نہیں کہ ان کے ذریعہ لکھے گئے خاکے ان اصحاب کے حق میں ہیں یا خلاف۔ اس بات کا اعتراف مجتبیٰ حسین بھی ''آدمی نامہ'' کے پیش لفظ ''دو باتیں'' میں یوں کرتے ہیں۔

''دو تین اصحاب کے بارے میں مجھے خفیہ اطلاعیں مل چکی ہیں کہ اب بھی چوری چھپے لوگوں سے استفسار کرتے رہتے ہیں کہ یہ خاکے ان کے خلاف ہیں یا ان کے حق مین''۔ ۳۰

موصوف کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ کسی کا مذاق اُڑانا اچھے مزاج کا شیوہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کا مضحکہ نہیں اُڑاتے' کسی کی دل آزاری نہیں کرتے بلکہ انسان کو بہ حیثیت انسان پیش کرتے ہیں اور نہایت ہی سلیقے سے اس کی خوبیوں اور خامیوں سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ ان کے طنز میں اکبر الہ آبادی کی طرح جارحانہ انداز نہیں پایا جاتا بلکہ جارج برناڈ شا کی سی لطافت اور نزاکت کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اچھی طرح یہ جانتے ہیں کہ کوئی شاعر یا فن

کار اپنی تعریف کے لیے کس قدر بے چین رہتا ہے، بہ ظاہر اس کا رویہ تعریف و توصیف سے بے نیازی کا ہوتا ہے لیکن یہ بے نیازی بلا وجہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے بھی آرزو مندی پوشیدہ ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس نکتہ کی طرف مخدوم کے خاکے میں بہت سلیقہ سے روشنی ڈالی ہے۔ دیکھیں اگلے چند اقتباسات جو دلیل کے لیے کافی ہیں:

''مخدوم بولے'' بھئی ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہئے۔ اس کا نام یا کلام چھپے یا نہ چھپے، اُسے تو بے تعلق رہنا چاہئے''۔[۳۱]

مجتبیٰ حسین نے ان کے اس قول کی روشنی میں ان پر بڑے ہی لطیف انداز میں طنز کیا ہے، ایک دن مخدوم، مجتبیٰ حسین اور ان کے کئی دوست اورینٹ ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ اچانک مجتبیٰ حسین کو شرارت سوجھی اور انہوں نے بے نیاز ہو کر کہا:

''مخدوم بھائی آپ کی ایک نظم دلی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ پوچھا کون سے رسالے میں''

میں نے کہا--- ''مجھے نام تو یاد نہیں مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آ رہا ہوں''۔

مخدوم تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے پھر اچانک کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے جیسا کہ ان کی عادت تھی پھر بولے--- ''اچھا اب چلتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے--- میرے ساتھ کچھ احباب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا--- ''مخدوم بھائی یہاں سے سیدھے بک اسٹال پر جائیں گے، چلو ہم بھی چلیں''۔ ہم لوگ بک اسٹال پر پہنچے تو مخدوم سچ مچ وہاں موجود تھے اور رسالوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی ہم پر ان کی نظر پڑی، انہوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے-- ''کیوں بے مسخرے ہم سے بدمعاشی کرتا ہے''۔ میں نے کہا-- ''مخدوم بھائی میں تو صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے''۔[۳۲]

مجتبیٰ حسین کے خاکے اپنے عنوانات میں بھی بلا کی کشش سموئے ہوتے ہیں جس سے قاری پہلی نظر میں ہی اس شخص کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پہلوؤں سے آشنا ہو جاتا ہے مثلاً

انہوں نے مسکراہٹوں کا آدمی، سجاد ظہیر' اردو شاعری کا ٹیڈی بوائے حکیم یوسف خان' پتھر کا آدمی عزیز قیسی، آخری شریف آدمی بھارت چندر کھنہ' کھویا ہوا آدمی سلام مچھلی شہری، بھیڑ کا آدمی فکر تونسوی' اپنا آدمی ابراہیم جلیس، منظوم آدمی رضا نقوی واہی جیسے کئی ایسے عنوانات تراشے ہیں جن کے ذریعے نہ صرف قاری کو اپنی گرفت میں لے لینے میں کامیاب ہیں بلکہ اس کے ذریعہ ایک ایسی فضا بھی تخلیق کرنے میں کامیاب ہیں، جس کا احساس عنوان پڑھتے ہی ہو جاتا ہے۔
ان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خاکوں کے آغاز میں ہی چند ایسے جملے لکھ جاتے ہیں جن سے متعلقہ شخصیت پر پوری روشنی پڑ جائے جیسے خشونت سنگھ کے خاکے میں وہ اس طرح کے جملے لکھتے چلے جاتے ہیں جس سے کوئی ذی فہم شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس کا ذکر مقصود ہے:

''انگریزی کا مایۂ ناز ادیب' صفِ اول کا دانشور' انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز کا ایڈیٹر' بے باک صحافی' ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا علم بردار' جادو بیاں مقرر' پارلیامنٹ کا ممبر' اردو کا پرستار' اقبال کا عاشق' اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کا بہی خواہ' کردار و گفتار کا غازی' گھبرایئے نہیں ذکر کئی شخصیتوں کا نہیں' ایک ہی شخصیت کا ہے اور وہ شخصیت ہے خشونت سنگھ کی''۔ ۳۳

اسی طرح کنہیا لال کپور' ابراہیم جلیس' کنور مہندر سنگھ بیدی کے خاکوں میں بھی وہ پہلے جملہ سے ہی قاری کو اپنے حصار میں لے لینے میں کامیاب ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں چند جملے:

''کنہیا لال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں' قطب مینار کی یاد آتی ہے''۔ ۳۴

''ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے مگر میرے لیے صرف افسانہ تھے''۔ ۳۵

''میری نظر میں بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے بزرگ وہ ہیں جن کی بزرگی پر ترس آتا ہے اور دوسری قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر پیار آتا ہے''۔ ۳۶

اُردو ادب کے پہلے خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیت بیگ نے خاکہ نگاری کے اصول وضع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک اچھا خاکہ اس وقت تک نہیں لکھا جا سکتا جب تک کہ خاکہ نگار کو اس شخص کے حالات سے ذاتی واقفیت نہ ہو' وہ بے باک نہ ہو اور غیر جانب دار نہ ہو' اس میں معروضیت اور راوایانہ دیانت داری نہ پائی جاتی ہو۔ جس طرح عہدِ حاضر کے ممتاز نقاد پروفیسر

شمیم حنفی نے بھی خاکہ نگاری کے اوصاف کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''خاکہ نگاری کا ناگریز وصف یہ ہے کہ لکھنے والا اور جس کا خاکہ لکھا جارہا ہے، وہ شخصیت دونوں ایک دوسرے سے قریب دکھائی دیں، ایک گہری شخصی سطح پر دونوں ایک دوسرے سے متعلق نظر آئیں۔ ایک ذاتی جذباتی رشتہ مصنف اور موضوع کے مابین کوئی فاصلہ نہ باقی رہنے دے۔ اس ذاتی تناظر کے بغیر سوانح یا تاریخ تو لکھی جاسکتی ہے، شخصی خاکہ نہیں لکھا جاسکتا''۔[۳۷]

مرزا فرحت اللہ بیگ اور پروفیسر شمیم حنفی کے وضع کردہ پیمانوں پر بھی مجتبیٰ حسین کے خاکے کھرے اترتے ہیں کیوں کہ انہوں نے ایسے لوگوں کے ہی خاکے لکھے ہیں، جن سے ان کے بہت قریبی تعلقات تھے یا ہیں، جس کا ثبوت سجاد ظہیر، فکر تونسوی یا پھر ابراہیم جلیس، عمیق حنفی، سلام مچھلی شہری، اور کنہیا لال کپور یا عہدِ حاضر کی ممتاز شخصیات مثلاً مقبول فدا حسین، خشونت سنگھ، مخمور سعیدی وغیرہ کے خاکے ہیں۔ یہ سبھی خاکے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ خاکہ نگاری کے فن میں ماہر ہیں۔ ساتھ ہی ان خاکوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ اس شخص کو دیکھتے سمجھتے پرکھتے اور برتتے ہیں، تب جاکر قلم اٹھاتے ہیں اور اسی قربت نے ان پر وہ سارے رازہائے دروں منکشف کردیئے ہیں جن کے ذکر سے خاکوں میں زندگی موجزن نظر آتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں جن سے مندرجہ بالا باتیں واضح ہوجائیں گی۔ سلام مچھلی شہری کے بارے میں کئی لطیفے سنانے کے بعد لکھتے ہیں:

''پدم شری کیا ہوتا ہے۔ سلام صاحب اپنی ماں کو سمجھاتے ہیں۔ ماں یہ تو صرف ایک اعزاز ہے۔ صرف میری عزت میں اضافہ ہوگا۔ اور ماں کہتی ہیں، اتنی ساری عزت لے کر تو کیا کرے گا اب ذرا دولت کی فکر کر تاکہ اپنی بچیوں کے ہاتھ پیلے کرسکے۔''[۳۸]

مجتبیٰ حسین کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی شخص کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو پیش کرنے کی اجتہادی کوشش سے گریز کیا ہے اور ان کے چھوٹے چھوٹے اوصاف کو بھی اپنے نرالے اور اچھوتے اسلوب کے سہارے ایسے سیاق وسباق میں پیش کردیا ہے کہ وہ بڑا اہم وصف بن گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ان کے تمام خاکے

توصیف سے شروع ہو کر توصیف پر ہی ختم ہوتے ہیں۔ جب کہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ خاکہ لکھتے وقت درمیان میں وہ ان خامیوں پر بھی نظر ڈالتے چلتے ہیں جو اس شخص میں موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی کے کمزور حافظے پر، اریب کی کمزوری صفیہ پر، مخدوم کے بار بار مصافحہ کرنے پر اور اعجاز صدیقی کا اپنی صحت کی خرابی کا بار بار ذکر کرنے پر یا پھر عمیق حنفی کا اپنے دوستوں سے قرض لے کر بھول جانے وغیرہ پر۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قارئین و ناظرین کو صاحبِ خاکہ کی زندگی کے Pros and Cons دونوں ہی دکھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں:

''صفیہ (مسز اریب) اریب کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت تھیں۔ ہر بات میں صفیہ کا بے موقع ذکر کرتے تھے۔ ایک دن فراق کی شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا فراق کی شاعری کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے ہے۔ اس پر اریب نے فوراً کہا۔ ''اور صفیہ کی بھی یہی رائے ہے'' یہ کہہ کر وہ یوں مطمئن ہو گئے جیسے صفیہ کی رائے کے بعد اب پروفیسر احتشام حسین کی رائے کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے''۔ ۳۹

انہوں نے مخدوم کی اس کمزوری پر بہت فن کارانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی نئی غزل سنانے کے لیے ہوٹل کے بیرے قاسم کو تین پیگ وہسکی پلا دی۔ اس کے بعد مخدوم نے قاسم سے کہا:

> ''اچھا قاسم! اب میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی تازہ غزل کے کچھ اشعار سنانا چاہتا ہوں' یہ سنتے ہی قاسم نے کہا --- صاحب بہت پی چکے ہیں۔ آپ کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ چلئے آپ کو گھر چھوڑ آؤں''۔ ۴۰

ابھی تک جتنی مثالیں پیش کی گئیں' ان سبھی سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ موصوف اپنے خاکوں کے عنوانات میں آزاد روی کے قائل ہیں نہ کہ عام خاکہ نگاروں کی طرح اپنی پسند کے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام خاکے فطری انداز میں آگے بڑھتے ہیں جو متعلقہ شخصیت کی کم و بیش بنیادی خصوصیات کا جذباتی و حسیاتی انداز میں احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سبھی خاکے جداگانہ انداز لیے ہوئے ہیں اور کوئی خاکہ دوسرے خاکے سے مماثلت نہیں رکھتا' جس میں ان کا شگفتہ اور ظریفانہ اندازِ بیان نہایت اہم رول ادا کرتا ہے۔ مثال کے لیے چند اقتباسات پیش ہیں:

''اریبؔ ایک دن اچانک بیمار ہو گئے۔ کسی نے بتایا کہ ان کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ ان دنوں ادب میں ترسیل کے مسئلہ پر رسالوں میں بحث چل رہی تھی۔ ایک دن اریبؔ سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا: اریب صاحب! آپ تو سچ مچ ترسیل کا مسئلہ بن کر رہ گئے ہیں''۔[41]

''سچ مچ حکیم صاحب کا کلام بڑا مفرح اور مقوی ہے۔ یقین نہ آئے تو پڑھ کر دیکھ لیجئے آزمائش شرط ہے''۔[42]

ان کے تمام خاکوں میں مخدومؔ محی الدین کا خاکہ ادائیگی فن کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے کیوں کہ اس میں حسی قوتیں اتنی متحرک نہیں جتنا کہ معروضیت کے تئیں ذہن کا تحرک۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خاکہ ساخت کے اعتبار سے دوسرے تمام خاکوں سے ذرا مختلف ہے۔ اس خاکے میں مجتبیٰ حسین نے بیرونی خط کشی کے سہارے مخدومؔ کی شخصیت کے ساتھ ہی ساتھ حیدرآبادی تہذیب سے قاری کو آشنا کرانے کی کوشش بھی کی ہے اور خاکے میں بعض رمزی اشاروں کے سہارے مخدومؔ کی شخصیت کی مختلف جہتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً:

''مخدومؔ ایک انسان نہیں تھے جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی۔ ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔ اس شہر میں کئی سڑکیں تھی، کتنی گلیاں تھی، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے''۔[43]

مجتبیٰ حسین نے اس خاکے میں مخدومؔ کی بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور اپنا مذاق آپ اڑانے کی صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اورینٹ ہوٹل کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پوچھا ''نہاری ہے--- بیرا بولا۔ ''نہیں ہے''۔ مخدوم نے پوچھا---- ''آملیٹ ہے'' بیرا بولا۔ ''نہیں ہے''۔ مخدوم نے پوچھا-- ''کھانے کے لیے کچھ ہے''۔ بیرا بولا نہیں ہے''۔ اس پر مخدوم بولے---- ''یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے''۔[44]

اس خاکہ میں مخدوم کی دانشوری کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک رات سلیمان اریبؔ کے گھر پر حیدرآباد کے آرٹسٹ سعید بن محمد سے مخدوم نے کہا:

''شاعری مصوری سے زیادہ طاقت ور میڈیم ہے''۔سعید بن محمد نے برش بکف جواب دیا---- ''مصوری اور شاعری میں کیا تقابل' شاعری میں جو چیز تم بیان نہیں کر سکتے' ہم رنگوں اور فارم میں بیان کر دیتے ہیں۔تم کہو تو ساری اُردو شاعری کو پینٹ کر کے رکھ دوں۔مخدوم بولے---- ''ساری اُردو شاعری تو بہت بڑی بات ہے' تم ایک معمولی سا مصرعہ ہی پینٹ کر کے دکھاؤ ---- پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے''۔سعید بن محمد بولے---- ''یہ کون سی مشکل بات ہے' میں کینوس پر گلاب کی ایک پنکھڑی بنادوں گا''۔بولے---- ''پنکھڑی گلاب کی تو پینٹ ہو گئی مگر 'سی' کو کیسے پینٹ کرو گے''۔سعید بن محمد بولے---- ''سی'' بھی بھلا کوئی پینٹ کرنے کی چیز ہے؟''۔مخدوم بولے مصرع کی جان تو 'سی' ہی ہے۔سعید آج میں تمہیں جانے نہیں دوں گا جب تک تم 'سی' کو پینٹ نہیں کرو گے۔یہ سُنتے ہی سعید بن محمد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے''۔۴۵

مجتبیٰ حسین نے لفظوں کا آدمی--ڈاکٹر حسن الدین احمد کے خاکے میں کچھ اس طرح کا مزاحیہ پہلو نکالا ہے جس سے بے ساختہ ہنسی پھوٹ پڑتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں ایک اقتباس:

''اب میں نے انہیں تفصیل سے دیکھنے کی کوشش کی تو ان کی آنکھوں کے اوپر پھیلی ہوئی تفصیلی بھوؤں پر نظر جم کر رہ گئی۔ایسی تفصیلی بھوئیں مَیں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ایسی گھنی گنجان بھوئیں کہ لگتا ہے بھوئیں نہیں مونچھیں ہیں''۔۴۶

خاکہ نگاری کے ساتھ منظر نگاری مشکل کام ہے لیکن موصوف کے خاکوں میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جو ان کے اسلوب کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ملاحظہ فرمائیں ایک اقتباس' جس میں ان کا یہ فن کھل کر سامنے آتا ہے:

''حسن الدین احمد بدستور ہمارے دوست کی خادمہ کے آگے کھڑے رہے۔آس بھی کیا چیز ہوتی ہے۔پھر آہستگی سے بولے۔آپ کے صاحب نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔کیا وہ تمہیں اس بارے میں کچھ کہہ گئے ہیں؟ ہو سکتا ہے انہوں نے ہمارا کھانا تیار کروا دیا ہو۔یہ سنتے ہی بڑھیا گھر

کے اندر چلی گئی اور دروازے کے ایک پٹ کو بھیڑ کر اور دوسرے کو آدھا کھینچ
کر دروازے میں یوں کھڑی ہو گئی جیسے گولکنڈہ کے قلعے پر اورنگ زیب کے
حملے کے وقت عبدالرزاق لاری قلعے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس
نے کہا معاف کرنا یہاں کوئی کھانا وانا تیار نہیں ہوا ہے۔ میں خود دوپہر سے
بھوکی ہوں۔ صاحب کل آجائیں گے تو ان سے بات کیجئے''۔ ۴۷

اس واقعہ سے تو آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ مجتبیٰ حسین کسی معمولی واقعہ کو بھی غیر معمولی بناتے ہوئے مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں کہیں بھی پیچیدگی نظر نہیں آتی بلکہ زبان نہایت صاف، شستہ اور رواں دواں ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین لفظوں کے رمز شناس ہیں اور وہ سیاق وسباق کی تبدیلی سے کچھ اس طرح کے لطیف پیرائے تراش لیتے ہیں جو ہمیں زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے کرشن چندر کے خاکے میں ان کے ہاتھ پر گدے (Tattoo) ہوئے نام کو دستی ویزیٹنگ کارڈ کا نام دے دیا۔ آل احمد سرور سے لئے ہوئے آٹو گراف کو ''تحفۃ السرور'' گردانے لگے۔ انڈر گراؤنڈ کا ترجمہ زیر زمین کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ ان کی ایک خوبی اور بھی ہے جس میں وہ دوسروں کا طرز تحریر اختیار کر کے خاکے میں جان ڈال دی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ایک اقتباس جس سے کوئی بھی شخص لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''بدھ کا دن، بارہویں تاریخ جنوری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے،
ڈاک کا ہرکارہ آیا، تمہارا نامہ لایا، میرا ماتھا ٹھنکا اور بڑی دیر تک ٹھنکتا رہا۔
اول تو میں تمہارا نامے کو پڑھ کر ہنسا پھر رویا کیا۔ تم سمجھو گے اس ہنسی کا
تمہاری مزاح نگاری سے کوئی ربط باہم ہوگا، نہیں۔ واللہ باللہ اس خوش فہمی کو
رفع کر لو۔ میں ہنسا اس واسطے کہ تمہارا نامہ برخوردار سعادت اطوار ذہین
نقوی کے جشن کی خبر لایا''۔ ۴۸

موصوف کی انہیں خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر محمد حسن نے لکھا کہ:

''مجتبیٰ حسین زندگی اور الفاظ کے پیچھے بنتی بگڑتی لطافتوں سے پیکر تراشی کا ہنر رکھتے ہیں اور طنز سے نہیں، خوش دِلی سے لطف سخن پیدا کر لیتے ہیں''۔ ۴۹

اگر مجتبیٰ کے خاکوں کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ وہ اپنی

تحریروں میں کرخت اور سخت الفاظ بہت کم لاتے ہیں بلکہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو نرم' مدھم اور دلکش ہوتے ہیں اور ان کی نشست سے سماعت مسحور ہو کر رہ جاتی ہے اور ایک انجان شخص بھی ان کے خاکوں میں جانا پہچانا سا لگنے لگتا ہے۔ مثلاً خورشید الاسلام کے متعلق انہوں نے یہ الفاظ تحریر کیے ہیں:

''ایک شام میں اچانک پروفیسر گوپی چند نارنگ کے گھر چلا گیا تو وہاں ایک صاحب کو دیکھا۔ میانہ قد' سانولا رنگ' سفید بال' گٹھا ہوا کسرتی بدن' چشمے کے پیچھے سے کچھ جھانکتی اور کچھ بولتی ہوئی ذہین آنکھیں اور تیکھے نقوش۔ میں نے فوراً تاڑ لیا کہ آج ضرور کسی بڑے آدمی سے ملاقات ہوگی اور میرا اندیشہ اس وقت صحیح نکلا جب پروفیسر نارنگ نے مجھ سے کہا---''ان سے ملو یہ پروفیسر خورشید الاسلام ہیں''۔ ۵۰

مجتبیٰ حسین کے اسلوب کی شناخت سادگی و پرکاری سے کی جا سکتی ہے جس میں بذلہ سنجی اور چھیڑ چھاڑ ہر جا نمایاں ہے۔ مثالیں تو کئی دی جا چکی ہیں لیکن ایک مثال دے کر میں اپنی بات مزید واضح کرنا چاہوں گا کہ وہ نازک موقعوں پر بھی کس طرح اپنے فن سے کام لے کر ماحول کو خوش گوار بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دیکھیں مخدوم محی الدین کے خاکے کی چند سطریں جس میں وہ کچھ اس طرح کے جملے لکھتے ہیں:

''مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے--اور پھر وہ زیر زمین چلے گئے مگر وہ اس بار زیر زمین جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے''۔ ۵۱

اس میں شک نہیں کہ یہ موقع نہایت غم ناک اور اندوہناک تھا۔ ایک نہایت چہیتا بزرگ راہی ملک عدم ہو گیا تھا لیکن انہوں نے غالب کی طرح ایسے موقعے پر بھی بذلہ سنجی اور زندہ دلی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور لفظوں کی بازی گری سے مزاح پیدا کر دیا۔ ایسا ہی کچھ غالب نے بھی اپنے دوست کی تعزیت میں اس قسم کے جملے لکھ کر کیا تھا:

''یوسف مرزا! تجھے کیوں کر کہوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ' مجھ سے کوئی پوچھے کہ بے سروپا کسے کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو''۔ ۵۲

ملاحظہ فرمایا آپ نے ایسے موقعے پر مجتبیٰ حسین تعزیت بھی پیش کر رہے ہیں اور بذلہ سنجی بھی

ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کیوں کہ یہی فن کاری ہے جس پر موصوف کھرے اُترتے ہیں۔ اگر آپ آدمی نامہ کا ہی مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ مجتبیٰ حسین کے مطالعے میں کافی وسعت اور تنوع ہے جبھی تو وہ اس قسم کا انداز اختیار کرتے ہیں اور کامیاب بھی رہتے ہیں۔ ان کے مضامین اور خاکوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے اسلوب کی جھلک بھی نظر آتی ہے جسے میں ایک مثال کے ذریعے واضح کرنا چاہوں گا۔ پطرس بخاری کا مضمون کتے اور مجتبیٰ حسین کا خاکہ نریندر لوتھر شیشے کا آدمی دونوں کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو خود یہ احساس ہوگا کہ مجتبیٰ حسین بھی کتوں سے متعلق پطرس سے کم علم نہیں رکھتے۔ دیکھیں چند سطریں:

> "---لوتھر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ بڑے عہدیدار کتے کو صرف اس لیے پالتے ہیں کہ وہ انہیں بھونکنا سکھا سکیں۔ اس معاملے میں میری رائے یہ ہے کہ لوتھر صاحب اپنے کتے سے کم سیکھتے ہیں اور کتا ان سے زیادہ سیکھتا ہے---ایک بار جب میں ان کے گھر گیا تو دیکھا کہ ان کا کتا ایک درخت کے نیچے بیٹھا بکری کی طرح جگالی کر رہا تھا۔ میں کتے سے بہت گھبراتا ہوں۔ اسے دیکھ کر واپس جانا چاہتا تھا۔ لوتھر صاحب کے ملازم نے کہا صاحب! اس کتے سے نہ ڈریئے یہ تو بالکل گدھا ہے' نہ بھونکتا ہے' نہ کاٹتا ہے ایسا اہنسا وادی کتا آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ یہ چوکیداری نہیں کرتا بلکہ افسری کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چوکیداری کا کام بھی نہ صرف مجھ کو ہی کرنا پڑتا ہے بلکہ ہنگامی حالت میں دُم بھی ہلانی پڑتی ہے"۔ [۵۳]

ان کے اسلوب کی ایک خوبی لطیفہ گوئی اور لطیفہ سازی بھی ہے جس کا اعلان وہ خود کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً مجھے وہ لطیفہ یاد آرہا ہے' آپ بُرا نہ مانیں تو ایک لطیفہ سنا دوں' یہ تو ایک لطیفہ معترضہ تھا' مجھے اس وقت ایک لطیفہ یاد آرہا ہے' مجھے وہ لطیفہ یاد آرہا ہے وغیرہ وغیرہ جس سے قاری ذہنی طور پر بوجھل نہیں ہوتا بلکہ مطابقت پیدا کر لیتا ہے اور ان لطائف سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔

انہوں نے ابراہیم جلیس کے علاوہ تقریباً سبھی خاکوں میں لطائف کا استعمال کچھ اس خوبی سے کیا ہے کہ وہ لطیفے اس کی شخصیت کے عکاس بن گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو سنے سنائے ہیں' کچھ خالص طور پر ان کے ذریعہ تراشے گئے ہیں جس میں ادبیت کی ایسی شان پیدا ہوگئی ہے جو فکاہی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہونے کی صلاحیت سے معمور ہے۔ مثلاً خواجہ

عبدالغفور کا خاکہ لطیفوں کا آدمی میں انہوں نے موصوف کا حال ایک لطیفے کے سہارے یوں بیان کیا ہے:

''بمبئی میں غفور صاحب کا حال اعرابی کے اونٹ کا سا ہے جس سے کسی نے پوچھا۔ تم کیا کھاتے ہو؟ اعرابی نے کہا---''اونٹ''۔ کیا پیتے ہو' اعرابی نے جواب دیا' اونٹ' کہاں رہتے ہو؟ 'اونٹ'۔ مخاطب اس اونٹ اونٹ کی تکرار سے اُکتا کر بولا۔ میاں یہ کیا اونٹ اونٹ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اعرابی بولا صاحب اونٹ کا گوشت کھاتا ہوں' اونٹ کا دودھ پیتا ہوں' اونٹ کی کھال پہنتا ہوں اور اونٹ کی کھال کے خیمے میں رہتا ہوں۔ بھلا اس میں چڑنے کی کیا بات ہے''۔ ۵۴

اسی خاکے سے ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیں جس میں بڑے ہی اچھوتے انداز میں انسانی فطرت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

''ایک آئی ایس عہدیدار کو اپنے ماتحتین کو لطیفے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر روز شام کے وقت اپنے ماتحتین کو طلب کرتے اور لطیفے سنانے لگتے۔ ماتحتین ان لطیفوں پر جی کھول کر ہنستے۔ ایک شام وہ حسبِ معمول اپنے ماتحتین کو لطیفے سنا رہے تھے۔ سب ہنس رہے تھے۔ مگر ایک ملازم بالکل خاموش تھا۔ اس نے ایک لطیفے پر بھی ہنسنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ محفل برخواست ہوئی تو اس ملازم کے دوسرے ساتھیوں نے پوچھا'' بھئی آخر تم نے صاحب کے ایک بھی لطیفے پر ہنسنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر بات کیا ہے''؟ اس پر ملازم نے کہا۔'' بھئی اب مجھے ہنسنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو کل سے وظیفہ پر علیٰحدہ ہو رہا ہوں''۔ ۵۵

لطائف کے علاوہ انہوں نے مقبول عام مصرعوں اور اشعار سے بھی کافی استفادہ کیا ہے اور کبھی کبھی تھوڑی سی تحریف سے ان کے معنوں میں ایک قسم کی وسعت بھی پیدا کردی ہے جو ان کی فن کاری پر دلالت کرتا ہے مثلاً:

وفا کیسی کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو ۵۶

☆

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے[۵۷]

☆

درو دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں[۵۸]

☆

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے[۵۹]

پیش ہے ایک اقتباس جس میں انہوں نے فیضؔ کے صرف ایک مصرع سے خوب صورت سا لطیفہ تخلیق کر کے پورے خاکے میں ایک لطیف اور خوش گوار فضا پیدا کر دی ہے۔ 'فیض انڈین کونسل فار کلچرل ریلشنز' کی دعوت پر ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ آزاد بھون میں ان کا جلسہ تھا۔ میرے برابر میرے دفتر کے ساتھی اور تاریخ کے پروفیسر ارجن دیو اور تاریخ کی استاد مس اندرا سری نواسن بیٹھے تھے۔ اندرا سری نواسن کو اُردو بالکل نہیں آتی تھی۔ مجھ سے کہا فیض کے شعروں کا انگریزی میں ترجمہ کرتا چلا جاؤں۔ جیسے تیسے ایک غزل کے دو تین شعروں کا ترجمہ انہیں سنایا۔ میں نے اندرا سے کہا کہ وہ باقی غزلوں کا ترجمہ ارجن دیو سے سنیں۔ جب فیض نے ''گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے'' والی غزل سنانی شروع کر دی تو ایک لطیفہ ہو گیا۔ جب فیض نے یہ مصرع سنایا ''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'' تو ارجن دیو نے کچھ رک کر اور سنبھل کر اس مصرع کا ترجمہ اس انداز سے کیا:

Faiz says, "Please come so that the business of garden may start"

اس پر اندرا نے حیرت کے ساتھ پوچھا:

Mr. Mujtaba! What is this business of garden. I have never heard about such business before. Is it a profitable business?

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر اندرا سے کہا ''اُردو شاعری میں تو یہ ''بزنس آف گارڈن'' بہت زمانے سے چل رہا۔ سراسر گھاٹے کا کاروبار ہے پھر بھی آپ گلشن کا کاروبار چلانا چاہتی ہیں تو ارجن دیو سے فیض کے شعروں کا ترجمہ سنتی رہیے۔ چناں چہ اس ''بزنس آف گارڈن'' کے چکر میں اب وہ اندرا سری نواسن سے اندرا ارجن دیو بن گئی ہیں''۔[۶۰]

اس کے علاوہ کئی مثالیں ان کے خاکوں میں بکھری پڑی ہیں جہاں انہوں نے اشعار و

مصرعوں کو اس طرح شامل کرلیا ہے کہ وہ خاکوں کا ہی حصہ لگنے لگتے ہیں مثلاً:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے[61]

☆

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں[62]

☆

شام کو بادہ کشی، شب کو تری یاد کا جشن
مسئلہ یہ ہے کہ دن کیسے گزارا جائے[63]

عام طور پر خاکوں میں گریز کی اتنی آزادی نہیں ہوتی جتنی کہ انشائیوں میں کیوں کہ اگر خاکہ نگار نفس مضمون سے ہٹ جاتا ہے تو قاری کا ذہنی تسلسل ٹوٹ جاتا ہے جو کہ اکثر گراں گزرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے ذریعے تحریر کردہ خاکوں میں یہ خامی پائی جاتی ہے۔ لیکن دوسرے خاکہ نگاروں مثلاً رشید احمد صدیقی کی طرح طویل اور بار بار گریز سے پرہیز کرتے نظر آتے ہیں اور بڑے ہی دبے قدموں سے موضوع پر دوبارہ واپس آجاتے ہیں اور خاکے کے بہاؤ میں فرق نہیں آنے دیتے اور اور کبھی کبھی تو بہ بانگ دہل موضوع پر آجاتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''ہاں تو میں قبلہ کا ذکر کر رہا تھا' بات چل رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔

ماحصل یہ کہ خاکہ نگاری کا فن ایک مشکل فن ہے جس میں خاکہ نگار اپنے منفرد ویژن (Vision) کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اسے ان شخصیتوں کی نفسیات اور اس کی بے پناہ گہرائیوں میں بھی غوطہ لگانا پڑتا ہے تب جاکر وہ قاری کو جمالیاتی حظ عطا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جب تک وہ ان بے پناہ گہرائیوں میں نہیں اُترے گا' اسے یہ نہ معلوم ہوگا کہ کوئی شخص ایسا تھا تو کیوں تھا۔ یا ہے تو کیوں ہے اور اسی کیوں کے جواب کی تلاش میں فن کار اس شخصیت کے بے شمار' دلچسپ' انوکھے اور حقیقی پہلو کی طرف اشارہ کرجاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کو پڑھتے وقت بھی یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ اسی ''کیوں'' کے جواب کی تلاش میں ہیں اور انہوں نے اسی ادھیڑ بن میں ایک خوب صورت اور لطیف سا خاکہ ہمارے سامنے پیش کردیا ہے جس نے ان کی خاکہ نگاری کو لائق صد ستائش بنادیا ہے۔ اس ضمن میں آل احمد سرور کا خیال صدفی صد درست معلوم ہوتا ہے کہ:

''مجتبیٰ کا مطالعہ اور مشاہدہ زندگی وسیع ہے۔ وہ زندگی کو صرف ایک ٹھہرا ہوا دریا نہیں بلکہ موجیں مارتا ہوا سمندر سمجھتے ہیں جس کی لہروں میں نشیب و فراز کا آنا ضروری ہے۔ وہ زندگی کے ہچکولوں سے لطف لیتے ہیں۔ ان کی شوخ طبع ان کی قوتِ متخیلہ سے ہم آہنگ ہے جس کے نتیجے میں ان کی تحریروں اور خاکوں کے مزاحیہ اسلوب میں تشبیہ و تضاد کی پر کیف شکلیں ملتی ہیں''۔[۶۴]

آخر میں اس بات کو احمد جمال پاشا کے ان جملوں پر ختم کرتے ہیں جنہیں انہوں نے کمار پاشی کا خاکہ پڑھنے کے بعد ''نشاط افزا'' سیوان (بہار) سے لکھا تھا۔ یہ تعریفی جملے مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں تنقید اور تبصرہ دونوں ہی شامل ہیں۔

''واہ! واہ! کیا تشبیہیں' استعارے' رعایتیں' کنائے اور تلمیحات استعمال کی ہیں۔ میری جانب سے اس فن کارانہ' قہقہہ بار شاہکار پر بھر پور مبارک باد قبول کرو' کمار پاشی اگر اپنی شاعری سے زندہ نہ رہ سکتے تب بھی مجتبیٰ حسین کے خاکے سے زندہ رہیں گے''۔[۶۵]

☆☆☆

حواشی

۱۔ڈاکٹر صابرہ سعید — اردو میں خاکہ نگاری — ۹

۲۔نثار احمد فاروقی — دیدودریافت — آزاد کتاب گھر دہلی — ۲۶

۳۔ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ۱۸

۴۔ڈاکٹر خلیق انجم — عبدالحق کی خاکہ نگاری۔فن اور تنقید — ۷۱۔۳۷۰

۵۔ڈاکٹر اشرف رفیع — مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری۔شگوفہ — ۹۹

۶۔فرحت اللہ بیگ — نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی' کچھ میری زبانی

۷۔مولوی عبدالحق — چند ہم عصر — ۸۷

۸۔رشید احمد صدیقی — گنج ہائے گراں مایہ — ۱۸۷

۹۔ایضاً — ہم نفسانِ رفتہ — ۵۳۔۱۵۲

۱۰۔مجتبیٰ حسین — آدمی نامہ — حسامی بک ڈپو'حیدرآباد ۱۹۸۱ء

۱۱۔وحید اختر — شگوفہ جلد ۲۰ مجتبیٰ حسین نمبر' حیدرآباد جولائی ۱۹۸۷ء

۱۲۔ڈاکٹر اجمل نیازی — سونیئر جشن مجتبیٰ حسین' شارجہ' دبئی ۱۹۹۷ء

۱۳۔خشونت سنگھ — روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" نئی دہلی ۲۶ رنومبر ۱۹۸۳ء

۱۴۔مجتبیٰ حسین — قصہ مختصر — حسامی بک ڈپو'حیدرآباد ۱۹۷۲ء — ۱۳۲

۱۵۔ایضاً — آدمی نامہ — ایضاً — ایضاً — ۱۹۸۱ء — ۹

۱۶۔ڈاکٹر اجمل نیازی — سونیئر جشن مجتبیٰ حسین' شارجہ' دبئی ۱۹۹۷ء

۱۷۔مجتبیٰ حسین — آدمی نامہ — حسامی بک ڈپو' حیدرآباد ۱۹۸۱ء — ۸۹

۱۸۔ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ۹۲

۱۹۔ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ۶۴

۲۰۔ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ۵۶

۲۱۔ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ۵۹۔۵۸

۲۲۔ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ایضاً — ۶۰۔۵۹

۲۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶۳
۲۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶۳
۲۵۔مجتبیٰ حسین	قصہ مختصر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۲ء			۱۰۳
۲۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۸
۲۷۔ایضاً	جاپان چلو جاپان چلو	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۳ء	۸۹
۲۸۔مجتبیٰ حسین	آدمی نامہ	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۱ء	۱۳۳۔۳۴
۲۹۔شگوفہ جلد ۲۰	مجتبیٰ حسین نمبر	حیدرآباد نومبر ۱۹۸۷ء			
۳۰۔مجتبیٰ حسین	آدمی نامہ	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۱ء			۶
۳۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۸
۳۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۸۔۴۹
۳۳۔مجتبیٰ حسین	سو ہے وہ بھی آدمی	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۷ء			۶۷
۳۴۔ایضاً	آدمی نامہ	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۱	۹
۳۵۔ایضاً ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۶
۳۶۔ایضاً	سو ہے وہ آدمی	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۷ء	۳۹
۳۷۔شمیم حنفی	آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکیڈمی، نئی دہلی فروری ۱۹۹۱ء				۱۳
۳۸۔مجتبیٰ حسین	بہر حال	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۴ء			۱۰۴۔۰۵
۳۹۔ایضاً	قصہ مختصر	ایضاً	ایضاً	۱۹۷۲ء	۱۰۴۔۰۵
۴۰۔ایضاً	آدمی نامہ	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۱ء	۴۴
۴۱۔ایضاً	قصہ مختصر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۲ء			۱۰۷۔۸
۴۲۔ایضاً	قطع کلام	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۱ء	۱۳۰
۴۳۔ایضاً	آدمی نامہ	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۱ء	۵۰
۴۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۳
۴۵۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۶۔۴۷
۴۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۲۰
۴۷۔مجتبیٰ حسین	آدمی نامہ	حسامی بک ڈپو حیدرآباد		۱۹۸۱ء	۱۳۱
۴۸۔مجتبیٰ حسین	چہرہ در چہرہ	ایضاً	ایضاً	۱۹۹۳ء	۱۳۳
۴۹۔آج کل جلد اول	طنز و مزاح نمبر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۱ء			۶
۵۰۔ایضاً	آدمی نامہ	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۴

۵۱_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۵۰
۵۲_ڈاکٹر خلیق انجم	خطوط غالب	انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی			
۵۳_مجتبیٰ حسین	آدمی نامہ	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۱ء			۱۶۱
۵۴_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۱۴_۱۵
۵۵_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۱۲_۱۳
۵۶_مجتبیٰ حسین	چہرہ در چہرہ	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۹۳ء			۱۲۰
۵۷_ایضاً	آدمی نامہ	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۱ء			۳۳
۵۸_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۳۳
۵۹_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۵۱
۶۰_مجتبیٰ حسین	سو ہے وہ بھی آدمی	ایضاً	ایضاً	1987	۱۴_۱۵
۶۱_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۲۶
۶۲_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۳۷
۶۳_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۴۱
۶۴_شگوفہ جلد ۲۰	مجتبیٰ حسین نمبر حیدرآباد ۱۹۸۷ء				۱۰۵
۶۵_ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۴۲۴

مجتبیٰ حسین کے سفر نامے: ایک مطالعہ

ایک دانشور کا قول ہے کہ تخلیق کے دو مآخذ ہوا کرتے ہیں پہلا سفر اور دوسرا خواب۔ اگر کوئی ادیب خواب دیکھتا ہے تو اس کی تخلیقات افسانہ، کہانی، داستان اور ناول وغیرہ جیسی نثری اصناف کی شکل میں یا پھر اشعار کے قالب میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں جب کہ تخلیق کا مآخذ اگر سفر ہو تو وہ سفر نامے کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ زندگی سے موت کی جانب مراجعت بھی سفر کا ہی ایک روپ ہے یعنی کوئی شخص اگر مر کر زندہ ہو جائے اور کچھ لکھنے کی کوشش کرے تو وہ سفر نامہ ہی لکھنے کی کوشش کرے گا۔ شاید اسی لیے سفر نامے کو اُم الاصناف بھی کہا گیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام اصناف میں یہ صنف کچھ اس طرح گھل مل گئی ہے جیسے دریا میں مٹی اور دوسری اشیا گھل مل جاتی ہیں۔ یہی وہ اسباب ہیں کہ سفر نامہ پڑھتے وقت ہمیں کہیں پر افسانہ تو کہیں آپ بیتی یا خود نوشت اور یہاں تک کہ کبھی کبھی خاکہ، داستان اور نثری نظم وغیرہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اس سے قبل کہ مجتبیٰ حسین کے سفر ناموں پر روشنی ڈالی جائے، یہ جان لینا ناگزیز ہے کہ سفر کیا ہے؟ اور مختلف مشاہیر قلم نے سفر نامے کی تعریف وتوضیح کس طرح کی ہے۔ دراصل سفر عربی لفظ ہے۔ لغت میں جس کے معنیٰ مسافت طے کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسافت طے کرنے یعنی سفر کرنے میں انسان کو قدم قدم پر نت نئے تجربات، مختلف پریشانیوں اور گلفتوں وغیرہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے وہ بہت کچھ سیکھتا ہے جبھی تو انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ *Travel teaches tolerance*۔ یقیناً اسی لیے تمام مذاہب نے بھی

مسافر سے حُسنِ سلوک کی تاکید بھی کی ہے۔ اس سے مفر نہیں کہ ہر انسان کو اس کی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں سفر ضرور درپیش ہوتا ہے۔ خواہ وہ چند ساعت ہی کا کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ سفر کے ذریعہ ہی ہم دینی اور دنیوی دونوں قسم کے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ سفر کے ذریعہ ہی انسان زندگی کے نشیب وفراز اور نیک و بد میں تمیز کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار کر سکے کہ گوشہ نشینی اختیار کر کے شاید ہی کوئی انسان تہذیب وتمدن سے آشنا ہو سکا ہے۔ انسان کو صرف اسی وقت عروج حاصل ہوا ہے جب اس نے مختلف سفر کے ذریعہ دوسری اقوام اور مذہب وملت کے طرز معاشرت تہذیب وتمدن اور انتظامی امور سے فائدہ اٹھایا اور اپنی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا عمل انجام دیا۔ اگر ہم انسان کے سفر کی ابتدا کا جائزہ لیں تو انسان نے اسی وقت سے سفر کرنا شروع کر دیا تھا جب بابا آدم جنت سے زمین کی جانب تشریف لائے تھے۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ حضرت نوح نے حکمِ خدا سے سفر کیا' حضرت موسیٰ پیدا ہوتے ہی سفر کے مراحل سے گزرے' حضرت یوسف نے چاہ کنعاں سے مصر کے بازار اور قید خانے تک کا سفر کیا' حضرت ابراہیم نے خشکی کا سفر کرتے ہوئے مکہ کے بے آب وگیاہ صحرا پر خانہ خدا کی تعمیر کا فریضہ انجام دیا جو آج بھی عالم اسلام کے لیے مرکز رشد وہدایت ہے اور اتحاد ویگانگت کا مظہر بھی' جس کے طواف کی خاطر آج بھی تشنگان حق سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک سفر رام چندر جی نے بن باس کی شکل میں اپنے پتا کے حکم کی تعمیل میں کیا تھا' رسولِ خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کا سفر کیا جسے ہجرت کے مقدس نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہیں سے مسلمانوں کا سن ہجری شروع ہوا۔ امام حسین نے بھی بقائے انسانیت کی خاطر کربلا کا سفر کیا۔ اس طرح کے نہ جانے کتنے دوسرے مقدس اسفار کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ان مقدس اسفار کا ذکر تھا جن کی اپنی تاریخی اور مذہبی اہمیت ہے۔ یہیں پر اگر ہم خطا کار بندے بھی اپنے مذہبی اسفار کا ذکر کرتے چلیں تو شاید بے جا نہ ہوگا کیوں کہ تمام مذاہب نے اپنے اپنے عقیدت مندوں کو مقامات مقدسہ کے سفر کا حکم دیا ہے۔ مثلاً قرآن کریم کا حکم ہے کہ ہر وہ مسلمان جو صاحب استطاعت ہے' اس پر زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ حج کرنا واجب ہے۔ جس کی بجا آوری کے لیے مسلمانوں کو مکہ معظمہ کی جانب سفر کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اہل ہنود کے یہاں بھی ان کے مقامات مقدسہ کے سفر کا حکم دیا گیا ہے اور اسی لیے ہر سال اہل ہنود

گنگا دھام، کشمیر، الٰہ آباد، بنارس وغیرہ کے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے جوق در جوق سفر کرتے ہیں۔ اس طرح چین، جاپان، برما اور دوسرے ممالک سے بدھ مت کے زائرین اپنے مقام مقدس بودھ گیا کی زیارت کی خاطر سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور سکھ مذہب کے ماننے والے دلی، امرتسر، پٹنہ وغیرہ کے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کر کے یہاں آتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی، یہودی و نصرانی وغیرہ بھی اپنے اپنے مذہبی مقامات کے سفر کو مقدس جانتے ہیں۔ اس تمہید سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ تمام مذاہب نے سفر کی افادیت و اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اسی لیے سفر کو کامیابی و کامرانی کا وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی

"السفر وسیلہ الظفر"

اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی قطعی گنجائش نہیں کہ دور دراز کے سفر سے انسانوں کو مختلف لوگوں سے تبادلہ خیال موقع کا فراہم ہوتا ہے۔ ان کے علوم و فنون، ایجادات اور عادات و اطوار وغیرہ سے آگاہی ہوتی ہے، جو ہماری تہذیبی اور ثقافتی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ان تمام اسفار کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا تاکہ اس کے پس منظر میں سفر کے آلام و مصائب کو دیکھ کر قارئین مسافر کی کامیابی و کامرانی کا اندازہ لگا سکیں جس میں بھی مسافر نت نئے تجربات و مشاہدات سے روبرو ہوئے تھے۔ یہ تو چند مذہبی اسفار کا ذکر تھا۔ اگر ہم دنیوی اسفار کا بھی تذکرہ کریں تو سفر کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ رسول اسلام نے اپنی حیات طیبہ میں مختلف سفر کیے۔ کبھی سیاسی مقصد کے لیے مکہ سے مدینے کا سفر کیا تو کبھی فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ تشریف لائے تو کبھی جنگ مدافعانہ کی خاطر سفر کے مراحل سے گزرے اور ہر جگہ سفر کامیابی و کامرانی کا وسیلہ بنا۔ اسی طرح مشہور سیاحوں مثلاً میگا ستھنیز، ہورو ڈوٹس، مارکو پولو، ابن بطوطہ، کولمبس، البیرونی، المسعودی، واسکوڈی گاما، میگالین، تسمان، کیپٹن کک، ہیمبولڈ وغیرہ کے سفر بھی کامیابی اور کامرانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس تذکرے سے یہ معلوم ہوا کہ دنیوی مقاصد کے لیے بھی سفر نہایت مفید ہوتا ہے۔ یہ بات صدفی صد درست ہے کہ گوشہ نشین شخص اتنا روشن خیال نہیں ہو سکتا جتنا کہ ایک مسافر و سیاح، یعنی تخلیقِ آدم ہی سے انسان سفر کے ذریعے نت نئے تجربات و مشاہدات سے آشنا ہونے لگا تھا۔ اس طرح سفر سنت

آدم قرار پایا اور آج ہر انسان دور دراز مقامات کی سیر کرنے کی خواہش رکھتا ہے کہ وہ آب وگل کے عجائب وغرائب دیکھے اور بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں اور قبیلوں سے رشتہ استوار کرے۔ظاہر ہے جب ایک شخص ان مراحل سے گزرتا ہے تو اس کے اندر ایک خواہش اور کروٹ لینے لگتی ہے کہ کاش وہ ان تمام تجربات واحساسات کو کسی کیمرے میں قید کر لے یا صفحۂ قرطاس پر محفوظ رکھے اور آج کل تو سفر کرنے والے حضرات کیمرے میں تمام مناظر کو قید بھی کرلیا کرتے ہیں لیکن اسے بھی اپنے دوستوں اور قرابت داروں کو دکھاتے وقت تشریح کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور اگر مبالغہ نہ ہو تو اسی تشریح وتفصیل کو سفر نامہ نگاری کی پہلی کوشش کہا جائیگا۔اس طرح اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ ایک مسافر کی خواہش کی تکمیل فن سفر نامہ نگاری کے ذریعہ ہی بخوبی ممکن ہو پاتی ہے یعنی سفرنامے کو داستان سفر اور روداد سفر کہا جاسکتا ہے۔فرہنگ آصفیہ کے مولف جان صاحب مولوی سید احمد دہلوی نے بھی اس کے مطالب بیان کرتے ہوئے اسے سیاحت نامہ' کیفیت سفر' روز نامچہ' سفر اور حالات وسر گزشتِ سفر قرار دیا ہے۔انگریزی الفاظ کا سہارا لیا جائے تو اسے *Motion Picture* کا نام دیا جائے گا۔شاید یہی وجہ ہے کہ *The Random House Dictionary of English Language* میں بھی اس کے معنیٰ

"*A motion or illustrated lecture describing travel*" درج ہیں۔

Webster Dictionary میں سفرنامہ یعنی *Travelogue* کے معنیٰ کچھ اس طرح رقم ہیں:

Discorse on traval, lecture,talk usu.with illustration (as slides or motion picture)

Cambridge internationai dictionary of English کے صفحہ نمبر ۱۵۵۳ پر اسے کسی خاص مقام پر سفر سے متعلق کتاب یا فلم قرار دیتے ہوئے اس کے معنیٰ یوں بیان کئے گئے ہیں۔

A film or book about traveling to or a particular place

اسی طرح *Webster new world dictionary of American English* میں اس کے معنیٰ کچھ اس قسم کے الفاظ میں درج ہیں۔

Travelogue(Travel+logue)- A lecture on travels ,usually accompanied by the showing of pictures, a film , usually short about a foreign or out-of- the-way place,esp one that emphasizes the places unusual or glamourouse aspects.

Edited by - Victoria Neufeldt & David B- Gauralink-1988

سفرنامہ یعنی *Travelogue* کے مندرجہ بالا مطالب میں ایک چیز قدر مشترک ہے کہ سفرنامہ نگار کو سفرنامے میں کسی خاص مقام کی سیر اس طرح کرانی ہوتی ہے کہ قارئین کی نگاہوں کے سامنے وہ ساری چیزیں آجائیں جن سے اس کا سابقہ پڑا تھا یعنی اسے اپنے اس عمل میں ایک کیمرہ مین اور ادیب دونوں کا ہی فریضہ انجام دینا ہوتا ہے۔اس طرح سفرنامہ نگار کا یہ عمل سفر کے مختلف اقسام مثلاً دینی' دنیوی' ادبی' تعلیمی' علمی' سیاسی' شاہی' سفارتی' جنگی' تجارتی' کاروباری' تفریحی یا مہماتی وغیرہ پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ٹھیک اسی طرح سفرناموں کے بھی مختلف اقسام قرار پاتے ہیں جن میں مذہبی سفرنامے' مقامی سفرنامے' مہماتی سفرنامے' موضوعاتی سفرنامے اور مزاحیہ سفرنامے اہم ہیں۔ان میں مذہبی اور دینی سفرنامے وہ سفرنامے ہیں جو دینی اور مذہبی ارکان بجالانے کی غرض سے تشریف لے جانے والے زائرین' حجاج اور بھگت وغیرہ تحریر کیا کرتے ہیں جس میں وہ اپنے سفر کا حال کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ سفر کی روداد تو بیان ہو ہی جائے ساتھ ہی ساتھ ان فرائض کے ادا کرنے کا طریقہ بھی قاری کو معلوم ہو جائے جن سے وہ بہ نفس نفیس گزرا ہے۔ اس قسم کے سفرنامے مکہ معظمہ' کربلائے معلیٰ' نجف اشرف' کاظمین' مشہد مقدس' بغداد شریف' اجمیر شریف' یروشلم' بیت اللحم' ہندوؤں کے چاروں دھام (کاشی وشوناتھ' وارانسی جگن ناتھ دھام پوری' دوارکا ناتھ' گجرات اور رامیشورم' تمل ناڈو) سکھوں کے گرودوارہ بنگلہ صاحب گولڈن ٹمپل وغیرہ کے اسفار کے بعد لکھے جاتے ہیں۔ کعبہ نما' سفرنامہ حرمین' رہنمائے حجاج اور لبیک وغیرہ سفرنامے اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مقامی سفرنامے وہ سفرنامے ہیں جو کسی خاص مقصد کے تحت اس شہر کے سفر کے بعد تحریر کئے جاتے ہیں مثلاً سفرنامہ پنجاب' سفرنامہ کشمیر' سیر دہلی وغیرہ۔ان کے علاوہ موضوعاتی سفرنامہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہوا کرتا ہے جس میں سفرنامہ نگار کسی خاص موضوع مثلاً تاریخ' جغرافیہ' ادب و معاشرت اور مذہبی رجحانات وغیرہ کو مرکز میں رکھ کر لکھتا ہے جیسے ہیون سانگ' فاہیان' فردوسی وغیرہ کے ذریعہ لکھے گئے سفرنامے' سفرناموں کے اقسام میں مزاحیہ

سفرنامہ ایک خوش گوار اضافے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سفرنامہ نگار سفر کے احوال وکوائف بڑے ہی دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں رقم کرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے یہ سفرنامے مزاحیہ سفرناموں کی صف میں شامل کئے جاتے ہیں۔ سفرنامے خواہ وہ کسی قسم کے ہوں اور کسی مقصد کے تحت لکھے گئے ہوں، ان کا اولین اور بنیادی مقصد اپنے تجربات و مشاہدات کو دوسروں سے Share کرنا ہوتا ہے۔ جس میں بیانیہ انداز نہایت اہم رول ادا کرتا ہے۔ بقول قطب النساء ہاشمی:

''سفرنامے بنیادی طور پر ان دلیروں و جاں بازوں کے مہمات و مشاہدات کے نتیجے ہیں جو اپنی جستجو اور کھوج میں جان کی بازی لگادیتے ہیں اور موت سے کھیلنا انکا شوق پیہم تھا۔ عجیب وغریب واقعات سے بھرپور سفر، نادر اشیاء کی دریافت، تجربات اور مشاہدات کی رنگارنگی نے ان تحریروں میں نوع نوع کی خصوصیات کو داخل کردیا تھا''۔ [۵]

سفرنامے کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد، سیر ایران کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں کہ

''سفرناموں میں انسانی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو تاریخ ادب اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں میں تاریک چھوڑ دیے گئے ہیں جیسے معاشرتی طور طریق، رواج و عقائد، مذہبی تعلقات، تجارتی و صنعتی خصوصیات، فرقے، زبانیں، شکل وصورت سفرناموں کی ایسی خصوصیات ہیں جس نے اس کو جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے منفرد کردیا ہے''۔ [۶]

ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تصنیف ''اردو ادب میں سفرنامہ'' میں سفرنامہ نگاری کے فن سے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے۔

''سفرنامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علم تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط دلچسپ اور خوش گوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ان سب سے فائدہ ضرور اٹھاتی ہے۔ سفرنامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے

اس مشاہدے کو سفرنامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کا تحرک محسوس کر لیتا ہے اور اس میں مکمل کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب سفرنامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو"۔ ۷

ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظر میں

"ایک کامیاب سفرنامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحۂ رواں میں آنکھ، کان، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شئے نظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشہ، نغمہ ونکہت کا ہر صوت و رنگ لفظوں کی امیجری میں جمع ہو کر بیان کو مرقع بہار بنا دے اور قاری کو ان تمثالوں میں جذب ہو کر اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنائے"۸

مرزا حامد بیگ کا خیال ہے کہ

"سفرنامہ ایک مستقل بیانیہ ہے جس میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے البتہ سفر سے متعلق ہونے کے باعث سفرنامے میں تحیّر کا عنصر نمایاں تر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفرنامے کی پیش کش ادبی نوع کی ہوگی نہ کہ صرف مسافر کا بیان۔"۹

تمام بڑی اصناف کی مانند سفرنامے کی صنف بھی ہمارے یہاں فارسی کے توسط سے ہی آئی اور مرزا طالب اصفہانی کا سفرنامہ یورپ (۱۸۹۹۔۱۸۰۳) میسر طالبی فی بلاد افرنجی" فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کی شکل میں پہلی بار شائع ہوا۔ لیکن اردو میں شائع ہونے والا پہلا سفرنامہ "عجائبات فرنگ" ہے جسے یوسف خاں کمبل پوش نے تحریر کیا تھا جو حیدر آباد کے باشندے تھے۔ یہ سفرنامہ پہلی مرتبہ پنڈت دھرم نارائن کے زیر نگرانی دہلی کالج کے مطبع العلوم پریس ۱۹۴۷ء میں زیور اشاعت سے آراستہ ہوا جسے تحسین فراقی نے نہایت ہی معلوماتی مقدمے کے ساتھ ۱۹۸۳ء میں دوبارہ ترتیب دے کر اللہ والا پرنٹرس شاہ راہ قائد اعظم لاہور سے شائع کیا۔ کمبل پوش نے یہ سفر ۳۰/مارچ ۱۸۳۷ء کو بحری سفر سے شروع کیا اور ۳۱/اگست ۱۸۳۷ء میں لندن سے ازابیلا جہاز سے اتر کر پھر ایک کشتی میں لندن کی طرف عازم سفر ہوئے۔ یعنی یہ داستان سفر پانچ ماہ پر محیط ہے جس میں کمبل پوش نے اپنے سفر کے تمام

واقعات و حادثات من و عن بیان کر دئے اور اپنا شمار ایک حقیقت نگار کے طور پر کرانے میں کامیاب ہیں۔ تحسین فراقی کا بیان ہے:

> ''کمبل پوش کی تاریخ یوسفی یا عجائبات فرنگ'' اردو کا پہلا سفر نامہ نہیں ہے' سفر نامے کا اہم ترین سنگ میل بھی ہے اور اس پر جدید سفر نامے کی اصطلاح کا اطلاق بھی بہت حد تک ہوتا ہے۔ عجائبات فرنگ' ان میں اولیت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اسلوب اور لوازمے کے اعتبار سے بے مثال سفر نامہ ہے''۔[۱۰]

اس سفر نامے کے بعد کئی اور سفر نامے لکھے گئے جن میں سر سید کا سفر نامہ ''مسافران لندن'' علامہ شبلی نعمانی کا سفر نامہ ''سفر نامہ روم و مصر و شام'' مولانا محمد حسین آزاد کا سفر نامہ'' نگارستان فارس'' قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ ''نقشِ فرنگ'' بیگم حسرت موہانی کا سفر نامہ ''سفر نامہ عراق' علامہ سید سلیمان ندوی کا سفر نامہ ''سیر افغانستان'' سفر نامہ انگلستان'' برید فرہنگ'' مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار کا سفر نامہ ''سفر نامہ یورپ'' ہند و پاک کے جلیل القدر اور اعلا مرتبت صاحب طرز ادیب و انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی کا ''سفر حجاز'' خواجہ غلام الثقلین کا سفر نامہ'' ایران اور ترکی'' وغیرہ تاریخی اہمیت کے حامل سفر نامے ہیں۔ پیش ہے اردو میں سپردِ قلم کئے گئے سفر ناموں کی ایک فہرست جس سے سفر نامہ کے ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے:

تاریخ انگلستان	مولوی مسیح الدین	۱۸۵۶ء
عجائباتِ فرنگ (تاریخ یوسفی)	یوسف کمبل پوش	۱۸۷۳ء
زادِ مغرب	محمد عمر علی خاں	۱۸۸۰ء
سفر نامہ لالہ جنید رام	لالہ جنید رام	۱۸۸۶ء
سیرِ ایران	محمد حسین	۱۸۸۶ء
سفر نامہ یوروپ	مرزا اثار علی بیگ	۱۸۹۰ء
زادِ سفر	محمد عمر علی خان	۱۸۹۰ء
نیرنگ چین (ارژنگ چین)	محمد عمر علی خان	۱۸۹۳ء

سفر نامہ روم و مصر و شام	مولانا شبلی نعمانی	۱۸۹۴ء
آئینۂ فرنگ	محمد عمر علی خاں	۱۸۹۵ء
سیر حامدی	نواب حامد علی خاں	۱۸۹۶ء
سفر نامہ رئیس	محمد عمر علی خاں	۱۸۹۷ء
سیاحت فتح خاں	نواب فتح علی خاں قزلباش	۱۹۰۳ء
سفر نامہ بلاد اسلامیہ	مولوی عبدالرحمان امرت سری	۱۹۰۵ء
سیر یوروپ	نازلی رفیعہ بیگم	۱۹۰۸ء
سفر نامہ یوروپ	منشی محبوب عالم	۱۹۰۸ء
سفر نامہ حجاز و مصر و شام	نواب سلطان جہاں بیگم	۱۹۱۱ء
سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز	خواجہ حسن نظامی	۱۹۱۱ء
سرنامہ بغداد	منشی غلام الثقلین	۱۹۱۲ء
سیر برہما	ابوظفر ندوی	۱۹۱۲ء
روزنامچہ سیاحت	خواجہ غلام الثقلین	۱۹۱۲ء
سیاحت سلطانی	شاہ بانو	۱۹۱۵ء
زمانۂ تحصیل	عطیہ فیضی	۱۹۲۲ء
کالا پانی	مولوی محمد جعفر تھانیسری	۱۹۲۳ء
سفر نامہ ہندوستان	خواجہ حسن نظامی	۱۹۲۳ء
نقشِ فرنگ	قاضی عبدالغفار	۱۹۲۴ء
سفر نامہ یورپ	صغرا بیگم حیاء	۱۹۲۶ء
مشاہداتِ عرفانی	یعقوب علی عرفانی	۱۹۲۷ء
سفر نامہ اندلس	قاضی ولی محمد دبیر	۱۹۲۷ء
سفر نامہ دہلی	خواجہ حسن نظامی	۱۹۲۷ء
سفر نامہ شاہ افغانستان	مرتبہ مولانا زاہد القادری	۱۹۲۸ء
حقیقت جاپان	مولانا بدر الاسلام فضلی	۱۹۳۰ء
سفر حجاز	مولانا عبدالماجد دریابادی	۱۹۳۱ء

پردیس کی باتیں	مرزا احمد حسین بیگ	۱۹۳۱ء
سفرنامہ افغانستان	خواجہ حسن نظامی	۱۹۳۳ء
سیاحت نامہ	نواب ظہیر الدین	۱۹۳۳ء
مرقع حجاز	مولانا حشم الدین خاموش	۱۹۳۵ء
سفرنامۂ عراق	نشاط انشاء بیگم	۱۹۳۷ء
سفرنامۂ حجاز	نشاط انشاء بیگم	۱۹۳۷ء
مسافر کی ڈائری	خواجہ احمد عباس	۱۹۴۰ء
اعمال نامہ	سر رضا علی	۱۹۴۴ء
لینن گراڈ تا سمرقند	عشرت علی صدیقی	۱۹۴۴ء
لندن سے آداب عرض	آغا محمد اشرف	۱۹۴۶ء
سیر افغانستان	سید سلیمان ندوی	۱۹۴۷ء
۱۹۰۵ء کا جاپان	ڈاکٹر محمد حسین	۱۹۴۷ء
سفرنامہ یوروپ وامریکہ	نواب لیاقت جنگ بہادر	۱۹۴۷ء
دیارِ عرب میں چند ماہ	مولانا مسعود عالم ندوی	۱۹۵۰ء
جنوبی ہند میں دو ہفتے	جگن ناتھ آزاد	۱۹۵۰ء
ترکی میں دو ہفتے	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۱۹۵۱ء
سفرنامۂ پاکستان	خواجہ حسن نظامی	۱۹۵۲ء
شرق اوسط میں کیا دیکھا	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۱۹۵۳ء
عروس نیل	سلطانہ آصف قاضی	۱۹۵۳ء
ساحل اور سمندر	سید احتشام حسین	۱۹۵۴ء
سفرنامۂ صارم	مولانا عبدالصمد صارم	۱۹۵۵ء
کابل میں سات سال	مولانا عبیداللہ سندھی	۱۹۵۵ء
مشاہدات کابل و یاغستان	محمد علی قصوری	۱۹۵۵ء
رہ روانِ عمر کہ در سفر گزرد	مختار الدین آزاد	۱۹۵۸ء
اے بنی اسرائیل	قدرت اللہ	۱۹۵۸ء

پاکستان سے دیارِ حرم تک	نسیم حجازی	۱۹۶۰ء
کیوبا سے چند خطوط	عبداللہ ملک	۱۹۶۰ء
مسافران لندن	سر سید احمد خاں	۱۹۶۱ء
جہاں نما	ممتاز احمد خاں	۱۹۶۳ء
خوابوں کی سرزمین	صبا لکھنوی	۱۹۶۳ء
سات سمندر پار	اختر ریاض الدین	۱۹۶۳ء
نظر نامہ محمود نظامی	محمود نظامی	۱۹۶۳ء
یوروپ نامہ	حکیم محمد سعید	۱۹۶۵ء
جرمنی نامہ	حکیم محمد سعید	۱۹۶۴ء
آوارہ گرد کی ڈائری	ابن انشاء	۱۹۶۵ء
دھنک پر قدم	اختر ریاض الدین	۱۹۶۹ء
سفر نامہ ارض القرآن	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۱۹۷۰ء
جہانِ دیگر	قرۃ العین حیدر	۱۹۷۰ء
شب جائے کہ من بودم	شورش کاشمیری	۱۹۷۱ء
نکلے تیری تلاش میں	مستنصر حسین تارڑ	۱۹۷۲ء
دنیا گول ہے	ابن انشاء	۱۹۷۳ء
شوق آوارگی	عطاء الحق قاسمی	۱۹۷۴ء
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	ابن انشاء	۱۹۷۴ء
مسافتیں	عطاء الحق قاسمی	۱۹۷۵ء
لبیک	ممتاز مفتی	۱۹۷۵ء
دنیا میرے آگے	جمیل الدین عالی	۱۹۷۵ء
تماشا میرے آگے	جمیل الدین عالی	۱۹۷۵ء
سفر حج کے تاثرات	محمد محسن احمد حسن ٹونکی	۱۹۷۵ء
دکھلائے جا کے اسے مصر کا بازار	قرۃ العین حیدر	۱۹۷۶ء
ایک طویل ملاقات	وزیر آغا	۱۹۷۶ء

کوثر کے سفرنامے	کوثر چاند پوری	۱۹۷۷ء
کاروانِ حجاز	ماہر القادری	۱۹۸۸ء
مسافرانہ	محمد طفیل	۱۹۷۸ء
حدیثِ دل	عبداللہ ملک	۱۹۷۸ء
ہمالہ کے اس پار	راجہ انور	۱۹۷۸ء
رہ نوردِ شوق	ڈاکٹر عابد حسین	۱۹۷۸ء
پہاڑوں کے دامن میں	صبا مصطفیٰ	۱۹۷۹ء
دید و باز دید	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۱۹۸۰ء
سفرِ انگلستان	پطرس بخاری	۱۹۸۰ء
جاپان چلو جاپان چلو	مجتبیٰ حسین	۱۹۸۰ء
سیاحت ماجدی	مولانا عبدالماجد دریا آبادی	۱۹۸۰ء
ڈھائی ہفتے پاکستان میں	مولانا عبدالماجد دریا آبادی	۱۹۸۱ء
دھوپ کنارے	جمیل زبیری	۱۹۸۱ء
جزیروں کی سرگوشیاں	بلراج کومل	۱۹۸۲ء
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز	صالحہ عابد حسین	۱۹۸۲ء
سفر آشنا	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۱۹۸۲ء
زرد پتوں کی بہار	رام لعل	۱۹۸۲ء
باؤلی بھکارن	بشریٰ رحمن	۱۹۸۲ء
تم کو کہیں	ہرچرن چاولہ	۱۹۸۳ء
اے آب رود گنگا	رفیق ڈوگر	۱۹۸۳ء
پاکستان یاترا	جوگندر پال	۱۹۸۳ء
دو مسافر دو ملک	مسعود احمد برکاتی	۱۹۸۳ء
کوریا کی کہانی	حکیم محمد سعید	۱۹۸۳ء
ہمالیہ کے اُس پار	مرزا ادیب	۱۹۸۳ء
عجائبات فرنگ	یوسف خاں کمبل پوش مرتبہ تحسین فراقی	۱۹۸۹ء

زمین اور فلک	انتظار حسین	۱۹۸۴ء
دردِ دل کوشاں	شیخ منظور الٰہی	۱۹۸۴ء
سفرنامہ حجاز	مولانا غلام رسول مہر	۱۹۸۴ء
ترکی میں دو سال	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹۸۴ء
پیرس و پارس	ثریا حسین	۱۹۸۴ء
دنیا میرا گاؤں	خواجہ غلام السیدین	۱۹۸۵ء
ہند یاترا	ممتاز مفتی	۱۹۸۵ء
خوشبو کا سفر	کیول دھیر	۱۹۸۵ء
جوار بھاٹا	ذوالفقار احمد تابش	۱۹۸۶ء
دیارِ حبیب میں چند روز	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹۸۷ء
ہنزہ داستان	مستنصر حسین تارڑ	۱۹۸۷ء
دیکھا ہندوستان	حسن رضوی	۱۹۸۷ء
بیس دن انگلستان میں	وزیر آغا	۱۹۸۷ء
مسافرانہ	محمد طفیل	۱۹۸۷ء
سیر کر دنیا کی غافل	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۱۹۸۸ء
سرگودھا سے کراچی تک	راغب ثقیب	۱۹۸۸ء
سائیونارا	نجمہ افتخار	۱۹۸۹ء
رحمٰن کا مہمان	رفیع الزماں	۱۹۹۰ء
سفرِ عراق	قاضی محمد مجیب اللہ	۱۹۹۳ء
ازبکستان ۱۹۸۰ء میں	حکیم محمد سعید	۱۹۹۳ء
سوئے ازبکستان	کوثر نیازی	۱۹۹۳ء
کالام سے کافرستان تک	محمد پرویش شاہین	۱۹۹۳ء
وسط ایشیا: نئی آزادی نئے چیلنج	آصف جیلانی	۱۹۹۴ء
سفرنامہ اسپین و فلسطین	مولانا وحید الدین خاں	۱۹۹۸ء
نانگا پربت یلتستان داستان	مستنصر حسین تارڑ	۲۰۰۱ء

عہدِ حاضر میں اُردو سفر نامہ نگاری کو سب سے زیادہ پاکستان میں فروغ ملا۔ اس کی خالص وجہ یہ تھی کہ وہاں کے اُردو مصنفین کو بیرونی ممالک کے سفر کے زیادہ مواقع میسر ہوئے اور اس طرح ابن انشاء، اختر ریاض الدین، محمود نظامی، مستنصر حسین تارڑ، محمد خالد اختر، عطاء الحق قاسمی، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، پروین عاطف، ذوالفقار احمد تابش وغیرہ نے اپنے اپنے سفر ناموں کے ذریعہ اردو سفر ناموں کی تعداد میں عمدہ اضافے کئے۔ ہندوستان میں پروفیسر احتشام حسین کے سفر نامے ''ساحل اور سمندر'' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد رام لعل، گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، نریندر لوتھر، دلیپ سنگھ وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

اردو ادب میں مزاحیہ سفر ناموں کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے جو نام ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ ابن انشا کا ہے کیوں کہ وہی اس صنف کے موجد ہیں۔ ان کے پانچ مزاحیہ سفر نامے (۱) دنیا گول ہے (۲) آوارہ گرد کی ڈائری (۳) نگری نگری پھرا مسافر (۴) ابن بطوطہ کے تعاقب میں (۵) چلتے ہیں تو چین کو چلئے، مزاحیہ سفر ناموں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قبیل کے چند سفر نامہ پاکستان میں لکھے گئے جن میں کرنل محمد خاں کا سفر نامہ کافی اہم ہے۔ ہندوستان میں اس قسم کے سفر نامے بہت کم لکھے گئے ہیں پھر بھی مجتبیٰ حسین نے ''جاپان چلو، جاپان چلو'' لکھ کر ہندوستان میں لکھے گئے مزاحیہ سفر ناموں کو جو وقار و اعتبار بخشا ہے، وہ قابل صد ستائش ہے۔ حالاں کہ موصوف کے سفر نامہ جاپان سے پہلے پروین عاطف نے ''خوابوں کے جزیرے'' کے عنوان سے جاپان کا سفر نامہ لکھا تھا، ڈاکٹر محمد حسین نے بھی ۱۹۰۷ء کا جاپان (ادبی دنیا لاہور فروری ۹۷ء) کے عنوان سے ایک سفر نامہ لکھا تھا، اسی طرح پاکستانی سفر نامہ نگار اختر ریاض الدین کے یہاں بھی جاپان کے سفر کا حال ملتا ہے لیکن جو حسن و لطافت مجتبیٰ حسین کے سفر نامہ جاپان میں دیکھنے کو ملتا ہے، وہ دوسرے سفر ناموں میں بہ مشکل نظر آتا ہے۔ مجتبیٰ حسین سفر نامے کے آغاز سے ہی دلچسپ پیرایہ بیان اختیار کر لیتے ہیں اور بالکل سنجیدہ صورت حال کو بھی مزاحیہ شکل میں پیش کرتے ہیں جو ان کا خاص وصف ہے۔ دیکھیں اس سفر نامہ کا یہ اقتباس جس میں سفر جاپان سے پہلے درپیش حالات کا ذکر کیا گیا ہے:

''جولائی ۱۹۸۰ء کے مہینے کی بات ہے۔ایک دن حسب معمول دیر سے دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ خلافِ معمول افسر بالا نے ہمیں یاد کیا ہے۔ہم ہانپتے کانپتے ان کی خدمت میں پہنچے تو فرمایا۔ہم تمہیں جاپان بھیجنا چاہتے ہیں۔کیا تم جانے کے لیے تیار ہو----ہم نے کہا! ہم جانتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں جب کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اسے سزا کے طور پر ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔'' مانا کہ ہم دفتر دیر سے آتے ہیں لیکن یہ اتنا بڑا جرم نہیں کہ آپ ہمیں جاپان بھیج دیں''۔پھر جاپان سے ہم بیسوں چیز درآمد کرتے ہیں۔کیا اس ملک سے جاپان کو برآمد کرنے کے لیے ہم ہی ایک مناسب چیز رہ گئے ہیں''۔[۱۱]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سفرنامہ کے شروع ہی میں وہ حسبِ معمول اور خلافِ معمول کے دلچسپ استعمال سے قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیتے ہیں اور آخر کے دو جملوں میں ایک عجیب سی عاجزی اور سنجیدگی سے اسے اپنی گرفت میں جکڑے رہتے ہیں مانا کہ ہم دفتر دیر سے آتے ہیں لیکن یہ اتنا بڑا جرم نہیں کہ آپ ہمیں جاپان بھیج دیں۔یہ جملہ پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ انہیں جاپان بھیجنے کا عمل کالا پانی بھیجنے کے مثل ہے۔آگے کا جملہ مزید لطیف انداز اختیار کئے ہوئے ہے..... کیا اس ملک سے جاپان کو برآمد کرنے کے لیے ہم ہی ایک مناسب چیز رہ گئے ہیں۔اسی طرح انہوں نے آخر میں بھی درآمد اور برآمد دو متضاد لفظوں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔اسی طرح یونیسکو کی جانب سے جاپان میں منعقدہ سمینار میں جانے کے لیے اپنے انتخاب کا ذکر بھی بڑے لطیف انداز میں یوں کرتے ہیں:

> ''بولے جاپان کے بارے میں کیا جانتے ہو----'' ہم نے دماغ پر اور زور دے کر کہا! ہاں خوب یاد آیا' جاپان کی گڑیاں بہت مشہور ہیں' بولے ''بس اتنا کافی ہے جاپان کے بارے میں تو تم بہت کچھ جانتے ہو۔ہم جاپان کے دورے کے لیے تمہارا نام مرکزی وزارت تعلیم کو بھیج دیتے ہیں''۔[۱۲]

پندرہ ابواب اور ۷۰ اصفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ اپنے اندر جاپان کے متعلق ساری اہم معلومات یکجا کئے ہوئے ہے جس میں وہاں کی تاریخ' جغرافیہ' ثقافت' صنعتی ترقی' ادب' آرٹ وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔دیکھیں ایک اقتباس جس میں انہوں نے جاپان کی تاریخ یوں بیان کی ہے:

''نارا جاپان کا قدیم دار الحکومت رہا ہے۔ بعد میں ٹوکیو دار الحکومت بنا۔ پہلی صدی کے آخری ربع تک جاپان کے شہنشاہ یہیں رہا کرتے تھے۔ نارا اور ٹوکیو کے پگوڈوں کو دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے' لکڑی کی ایسی عظیم الشان عمارتیں بنانا جاپانیوں کا ہی حصہ ہیں---- کیوٹو ہی وہ شہر ہے جہاں ۱۸۶۸ء میں توکوگاوا فوجی حکمران خاندان کے آخری سربراہ نے شہنشاہ جاپان میجی کو اقتدار سونپا تھا کہ حضرت آپ ہی اس ملک کو سنبھالئے۔ ہم سے یہ نہیں سنبھلتا۔ ۱۸۶۸ء سے پہلے دنیا میں جاپان کی کوئی حیثیت تھی نہ اہمیت' میجی نے ہی وہ انقلابی فیصلے کئے جن کی بناء پر جاپان اتنی ترقی کر چکا ہے۔ شہنشاہ میجی نے ہی جاپان کے تعلقات امریکہ اور یوروپی ممالک سے پیدا کئے ورنہ اس سے پہلے جاپان گوشہ نشین سا ملک تھا۔ جاپانیوں نے صرف ایک صدی کے اندر مغربی ممالک کی سائنس اور تکنالوجی سے کچھ اس طرح استفادہ کیا کہ آج ترقی کے میدان میں مغربی ممالک سے آگے نکل گئے ہیں''۔ ۱۳

دیکھیں اگلا اقتباس جس میں مجتبیٰ حسین وہاں کی جغرافیائی صورت حال پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں کہ اس میں مزاح اور طنز دونوں کی لطیف جھلکیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں:

''ہائی اسکول تک جغرافیہ پڑھی تھی۔ اس وقت تو جاپان براعظم ایشیا ہی میں تھا۔ اب بھی شاید ایشیا ہی میں ہوگا۔ ہم ٹھیک سے نہیں کہہ سکتے کیوں کہ سنا ہے کہ جاپان نے بہت ترقی کر لی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب کدھر کو نکل جائیں۔ یوں بھی برّ اعظم ایشیا ہم جیسے ملنگوں کی سرزمین ہے جہاں پیٹ کی اہمیت کم اور روح کی زیادہ ہے۔ ہمیں غریبی میں نام پیدا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایسے برّ اعظم میں جاپان کا کیا کام؟۔ اگر ہم سے جاپان کے بارے میں مزید کچھ پوچھیں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور دوسری جنگِ عظیم عروج پر تھی تو یوں لگتا تھا جیسے جاپان ہمارے گھر کے پچھواڑے واقع ہے۔ ہمیں ہر دم بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اب آنے ہی والے ہیں۔ جنگ ختم ہوگئی اور جاپان پھر اپنے

جغرافیائی حدود میں واپس چلا گیا''۔[14]

گزشتہ عبارت میں مجتبیٰ حسین نے طنز کا ہدف خود کو اور برِ اعظم ایشا کو بنایا ہے جہاں غریبی، حرماں نصیبی، مفلوک الحالی، عدم مساوات جیسے ان گنت مسائل درپیش ہیں جن سے مغربی ممالک کا کوئی سروکار نہیں۔ خود کا مذاق اڑانا مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا ایک خاص وصف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بات مذاق ہی مذاق میں کہہ جاتے ہیں اور قاری یا سامع پر گراں نہیں گزرتا اور وہ حقیقت سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے جاپان کی ایک ایک چیز کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر کے ہندوستان لائے ہیں۔ دیکھیں موصوف جاپان کی صنعتی ترقی کا ذکر کس انداز سے کرتے ہیں:

''جاپانیوں کے پاس نہ وسائل ہیں نہ معدنیات کے ذخائر' کوئی خام مال ان کے پاس نہیں ہے۔ زراعت بھی بس ایسی ہے کہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ جاپان کے غریب باشندے سارا خام مال دوسرے ممالک سے درآمد کرتے ہیں۔ ان کا کمال صرف اتنا ہے کہ اس خام مال سے دنیا جہاں کی چیزیں بناتے ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو پریشان کرتے ہیں''۔[15]

''جاپان چلو، جاپان چلو'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد جاپان کے متعلق وہ ساری معلومات حاصل ہو جائیں گی جس سے کوئی نو وارد وہاں جا کر فائدہ اٹھا سکتا ہے مثلاً وہاں کی بلٹ ٹرین، وہاں کے بازاروں کا حال، ٹوکیو یونیورسٹی کا ذکر، وہاں پر اُردو کی حالت، ہوٹلوں میں کھانے کے آداب، وہاں کی مساجد کا ذکر (جہاں ہندوستانی مساجد سے قطع نظر تمام نمازیوں کو بعد نماز مفت کھانا ملتا ہے) وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ وہ جاپانی گیشیاؤں (جو ہندوستانی طوائفوں کے مثل ہوتی ہیں) کا بھی ذکر کرتے نظر آتے ہیں جس میں ان کے لہجے کی شرافت اور طنز کی کاٹ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ بہ قول میرزا ادیب:

''سفرنامہ نگار جو کچھ دیکھتا ہے' جو کچھ پاتا ہے' جس جس مقام سے گزرتا ہے' اس کی ساری خوشبو میں اس کے سارے باطنی رنگ اور اس کی وہ ساری کیفیات جو سر پردۂ راز ہوتی ہیں۔ ان سب کو سمیٹ لیتا ہے۔ وسائل اور ذرائع پر تکیہ کر کے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔ سفرنامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجربہ ہے' اسکا اطلاق انہیں معنوں پر ہوتا ہے جو تخلیقی تجربے سے وابستہ کے

جاتے ہیں"۔ ۱۶

میرزا ادیب کے مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اچھا سفر نامہ نگار کہلانے کا وہی مستحق ہے جو اثنائے سفر میں اپنے گردو پیش میں حالات وکوائف سے قاری کو مکمل طور پر روشناس کراتے ہوئے اپنا سفرنامہ تحریر کرے۔ اس طرح سفرنامہ نگار اپنے قاری کو حقیقی دنیا میں لے آئے۔ یہی طرز مجتبیٰ حسین نے اپنے سفرنامے "جاپان چلو جاپان چلو" میں اختیار کیا ہے۔ پیش ہے ایک اقتباس جس میں موصوف نے بلٹ ٹرین کے سفر کا ذکر اتنے اچھوتے انداز میں کیا ہے کہ میرزا ادیب کا یہ قول بھی سچ ثابت ہوجاتا ہے کہ سفرنامہ نگار جو کچھ دیکھتا ہے، وہی اس کی تحریر میں مترشح ہوتا ہے۔

"اس ٹرین کا انجن بالکل طیارہ کی شکل کا ہوتا ہے۔ دیکھنے میں بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ اس میں ۱۶ ڈبے لگے ہوتے ہیں۔ ساری ٹرین ایئر کنڈیشنڈ ہوتی ہے۔ ہم ٹرین میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے طیارے میں آگئے ہیں۔ نشستوں کا انتظام اسی طرح کا ہوتا ہے۔ یہ ٹرین ہانشو جزیرہ میں واقع ٹوکیو سے کیوٹو جزیرے میں واقع ہکاکا تک ایک ہزار ستر کیلومیٹر کا فاصلہ تقریباً چھ گھنٹوں میں طے کرتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے تیز رفتار ٹرین سمجھی جاتی ہے کیوں کہ یہ ایک گھنٹہ میں ۲۱۰ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے"۔ ۱۷

اس سفر میں ایک طرف مجتبیٰ حسین بلٹ ٹرین کی سہولیات اور تیز رفتاری سے مرعوب تھے تو دوسری طرف وہ ہندوستانی ٹرین اور یہاں کے دشوار کن سفر کے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے اور وہ ان تجربات کی تلاش میں تھے جو انہیں ہندوستانی ٹرینوں میں سفر کرتے وقت درپیش ہوتی تھیں اور آخر میں انہوں نے اس ذہنی ردوقبول سے تنگ آکر اپنے ہم سفر مسٹر تاجما سے سوال کر ہی ڈالا کہ کہاں کا سفر زیادہ اچھا ہے؟۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس جس میں مجتبیٰ حسین نے اپنے ملک کے مسافروں اور ٹرینوں پر بڑی ہی کاری ضرب لگائی ہے۔

"مسٹر تاجما! آپ ہندوستان کی ٹرین میں سفر کر چکے ہیں۔ ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں، وہ آپ کے ہاں کہاں۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکے نہ لگیں۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا، کسی نے ہمارے سر پر صندوق نہیں رکھا، کسی کا ہولڈال ہمارے پاؤں پر نہیں گرا، کسی

مسافر نے نشست کے لیے دوسرے مسافر سے لڑائی نہ کی اور وہ ہر اسٹیشن پر چائے لو چائے'' پان بیڑی' سگریٹ' والی مانوس آوازیں سنائی نہیں دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے۔

'' تاجما نے شرم کے مارے نظریں نیچی کرلیں بولے۔آپ ٹھیک کہتے ہیں ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے' یوں بھی جاپان سے ہندوستان کا کیا مقابلہ۔ ہمارا ملک چھوٹا ہے اور آپ کا ملک عظیم'' اور تاجما کی بات سن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا''۔ ۱۸

مجتبیٰ حسین'' جاپان چلو جاپان چلو میں'' ٹوکیو کے بازاروں کا حال کچھ اس طرح بیان کرتے نظر آتے ہیں:

'' ٹوکیو کے بازار دنیا بھر کی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کس کام میں آتی ہیں اور ان کے خریدار کون ہیں۔ یوں بھی ہمیں تو جاپانیوں کی محبت اور خلوص کے سوائے کچھ نہیں خریدنا تھا کیوں کہ یہی وہ چیز ہے جس پر وطن عزیز میں کسٹم والے کوئی ڈیوٹی نہیں لگاتے۔ وہ لاکھ تلاش کرلیں مگر ہمارے دل میں چھپی ہوئی محبت کی دولت کو کہاں پکڑ سکتے ہیں''۔ ۱۹

بات کسٹم کی چل نکلی ہے تو جاپان کے کسٹم والوں کا حال بھی سنتے چلیں کہ موصوف کا جاپانی کسٹم کلرک سے جب سابقہ پڑا تو ان پر کیا گزری۔ جاپانی کسٹم کلرک جب ان کے سامان کی تلاشی لے رہا تھا' اس وقت وہ ان کے پاس موجود بیدری کے بنے ہوئے ایش ٹرے اور دیگر اشیاء کو دیکھ کر مسحور تھا کہ ان میں سے یہ کالی سی چیز کس دھات سے بنی ہوئی ہے اور جب اس نے مجتبیٰ حسین سے پوچھا کہ یہ کیسے بنی ہے تو مجتبیٰ حسین پھولے نہیں سمائے۔ اس واقعہ کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے:

'' ہم نے اپنا سینہ پُھلا کر کہا ایسی چیزیں بنانا تو ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ سیاہ رنگ کی کیسے بن گئی تو بھیا یہ ہمارا'' ٹریڈ سکریٹ'' ہے۔ اگر آپ کو بتادیں تو ہماری کیا انفرادیت رہ جائے گی۔ ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر ایک ایش

ڑے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے یہاں کسٹم آفیسروں کو تحفہ پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں 'لازمی مضمون' کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ بھی لیجئے وہ بولا نہیں جیسی آپ کی انفرادیت ہے' ویسی ہماری بھی انفرادیت ہے''۔ ۲۰

تاریخ' جغرافیہ' صنعتی ترقی وغیرہ سے قطع نظر مجتبیٰ حسین کو وہاں کے لوگوں' ان کے عادات واطوار' ان کے اخلاق ومزاج وخصائل' ان کی رفتار وگفتار اور زندگی کے مختلف رویوں سے دلچسپی ہے۔ انہوں نے اپنے ۳۵ روزہ سفر کے دوران جاپان کو کھلی آنکھوں اور کشادہ ذہن سے دیکھا' پرکھا برتا اور سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جاپانیوں کی کم آمیزی' کڑی محنت' کردار پرستی اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی خصوصیت وغیرہ کو دل سے سراہا ہے۔ ان کی نظر میں جاپان حسین ملک تو ہے ہی' بڑا ہی عجیب وغریب ملک بھی ہے' بہت بڑا اور جاندار تہذیب کا ملک' اس کی اپنی معاشرت ہے' اپنی قدریں ہیں۔ اپنی معاشیات ہے' اس کا اپنا صنعتی اور تجارتی نظام ہے۔ روز مرہ کی زندگی کے اپنے آداب ہیں' مغربی لباس' مغربی سائنس تکنالوجی وغیرہ میں منتہا کا درجہ حاصل کرنے کے بعد جاپانی اپنے وطن' قوم اور اپنی تہذیب پر نازاں ہے۔ جاپان کے رہنے والے بلا کے محنتی' ذہین اور کاروباری لوگ ہیں۔

اس سفرنامے میں انہوں نے ہمیں سفر کے اہم تجربات دلچسپ معلومات' سنجیدہ مسائل وغیرہ سے بالکل نئے اور منفرد انداز میں آشنا کرانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ان کے تجربات ومشاہدات کا اہم کردار رہا ہے لیکن سفرنامہ پڑھتے وقت قاری کو اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے قہقہے برآمد کرنے اور طنز کے تیر چلانے کے کئی مواقع ضائع کر دیئے ہیں لیکن جاپان اور جاپانیوں کی عزت وآبرو پر حرف نہیں آنے دیا بلکہ طنز معکوس کا سہارا لے کر خود کو ہی طنز کا ہدف اور سرچشمہ بنایا ہے۔ شاید اسی لیے سید علی ناصر سعید عبقاتی نے اپنے مضمون 'جاپان چلو جاپان چلو' میری نظر میں'' لکھا ہے کہ:

''اس سفرنامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین نے شریف مہمان کی حیثیت سے جاپان کی کوئی برائی نہیں کی اور یہ بھی اس کی بڑائی ہے''۔ ۲۱

مجتبیٰ حسین کا فن یہ ہے کہ وہ ہنسی ہنسی میں دوسروں کی عظمتِ کردار کا اعتراف کر لیتے ہیں اور اپنے سماجی عیوب کی نشاندہی بھی۔ جیسے جرائم کی تعداد، پولیس کا نکما پن، تعصب کا مسئلہ وغیرہ جس کی پاداش میں فرقہ وارانہ فسادات تک ہو جاتے ہیں، ان نکات پر انہوں نے بحسن وخوبی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل تحریر سے میرا مطمحِ نظر واضح ہو جائے گا:

''پروفیسر تنا کا چوں کہ ہندی کے پروفیسر ہیں۔ اس لیے ہم نے ان سے پوچھا، آپ کے ہندی وِبھاگ میں کتنے وِدیارتھی شکشا پراپت کر رہے ہیں، بولے! میرے شعبے میں ساٹھ طلبا زیر تعلیم ہیں، ان کے منہ سے فارسی آمیز اُردو کو سن کر ہم بھونچکے رہ گئے۔ جاپان ریڈیو کے مسٹر اناہارا سے ہم نے پوچھا'' اور مہاشے جی آپ کے ریڈیو سے ہندی پرسارن کس سے ہوتا ہے''۔ بولے'' آپ غالباً جاپان ریڈیو کی نشریات کے نظام الاوقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا جاپان ریڈیو کے نظام الاقات تو ہم بعد میں جانتے رہیں گے، پہلے یہ بتایئے کہ آپ ہندی پروگرام کے انچارج ہیں لیکن اتنی اچھی اردو کیسے بول رہے ہیں--- مسٹر اناہارا بولے۔'' قبلہ یہ ہندی اُردو کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں، ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہے، تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی اور عربی سیکھ کر ہم حسب موقع آپ کی اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی (لوگ) ٹھہرے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت ہے۔ جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے وہ اُردو بھی جانتا ہے اور جو اُردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے۔ ہم نے دل میں سوچا اے کاش! ہمارے ملک میں بھی لوگ زبان کے معاملے میں کم از کم اتنے ہی کاروباری ہوتے تو ہندی اُردو کا جھگڑا ہی نہ ہوتا''۔ ۲۲

''جاپان وہ واحد ملک ہے جہاں جرائم کی تعداد سب سے کم ہے اگرچہ ہمیں پولیس نظر نہیں آتی تھی مگر پھر بھی ہر طرف امن ہی امن نظر آتا تھا، ہماری طرح نہیں کہ پولیس تو جگہ جگہ نظر آتی ہے لیکن امن و امان کہیں نظر نہیں آتا''۔ ۲۳

مجتبیٰ حسین کا یہ سفرنامہ نہ صرف سفرنامہ ہے بلکہ اس میں خاکہ نگاری، انشاپردازی اور طنز و مزاح کے ایسے جوہر دیکھنے کو ملتے ہیں جو کسی بھی سفرنامہ جاپان میں دکھائی نہیں دیتا۔ اس سفر نامے میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کی تین مختلف جہتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ خالص مزاح، طنز آمیز مزاح اور حزنیہ مزاح جس کی مثالیں پورے سفرنامے میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ مثالیں آگے درج ہیں۔ علاوہ ازیں اس سفرنامے میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل انسان دوستی کا وہ زاویہ نظر ہے جس کے سہارے موصوف چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں مثلاً کسٹم والوں نے ان سے پوچھا کہ ''آپ کو کچھ ڈکلیر کرنا ہے'' تو اس کا جواب انہوں نے یوں دیا:

''ہم نے کہا! غریب آدمی ہیں شرافت کے سوائے اور کیا ڈکلیر کر سکتے ہیں''۔ ۲۴

''جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے سوائے کردار کے''۔ ۲۵

''کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں خواب کے داخل ہونے کی گنجائش نہیں''۔ ۲۶

''یوں بھی براعظم ایشیا ہم جیسے ملنگوں کی سرزمین ہے جہاں پیٹ کی اہمیت کم اور روح کی زیادہ ہے۔ ایسے براعظم میں جاپان کا کیا کام۔ ہمیں غریبی میں نام پیدا کرنے کی عادت ہوگئی ہے''۔ ۲۷

''زندگی بھر ہمیں ایک اچھے پڑوسی کی تلاش رہی ہے جو کبھی میسر نہ آسکا''۔ ۲۸

''جاپانی بہت عمر چور ہوتے ہیں اس لیے آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہیے''۔ ۲۹

جاپانیوں کے مطالعہ کی عادت کے بارے میں بھی مجتبیٰ حسین نے بڑے ہی لطیف انداز میں کئی باتیں لکھی ہیں۔ دیکھیں ان کی یہ تحریر جس سے جاپانیوں کے ذوق مطالعہ پر کافی روشنی پڑتی ہے:

''صاحبو! اگر ہم نے اس سیمینار کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ ہم اپنے احساس کمتری پر قابو نہیں پا سکے۔ سارے ایشیا میں جاپانی سب سے زیادہ ''پڑھاکو'' قوم ہے اور دنیا بھر میں ان کی اشاعتی کاروبار کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جاپانی یا تو لکھتا ہے یا پڑھتا ہے، باتیں بہت کم کرتا ہے۔ جہاں جایئے لوگ کتابیں خریدنے

اور پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ٹوکیو میں ایک محلّہ ہے ''کندا'' جو شہنشاہ جاپان کے محل سے متصل ہے۔اس میں ہر طرف کتابیں ہی فروخت ہوتی ہیں۔کتابوں کی اتنی بڑی دکانیں ہم نے کہیں نہیں دیکھیں۔ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں بھی کتابوں کی فروخت کا انتظام موجود ہے۔چار پانچ سال کی عمر کے بچے بھی نہ صرف کتابیں خریدتے ہیں بلکہ انہیں پڑھتے بھی ہیں۔جاپان کی آبادی تقریباً ۱۱۵ء کروڑ ہے اور سال بھر میں تقریباً ۸۰ کروڑ کتابیں فروخت ہوتی ہیں گویا ہر جاپانی سال بھر میں ساڑھے چھ کتابیں ضرور خریدتا ہے''۔[۳۰]

''جاپان چلو جاپان چلو'' پندرہ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں یونیسکو کی چھتری، جاپان میں اُردو، جاپان میں اسلام، خوش رہو اہل وطن، ٹوکیو میں ہمارا ورودِ مسعود وغیرہ ابواب شامل ہیں۔تمام ابواب سے مثالیں تو نہیں پیش کی جاسکتیں۔پیش ہے ایک ایسا اقتباس جس میں انہوں نے جاپان میں اُردو کی موجودگی کا ذکر بڑے حسین انداز میں کیا ہے:

''بہ فضل تعالیٰ جاپان میں اچھی خاصی اُردو موجود ہے۔ہمیں وہاں اُردو کو تلاش نہیں کرنا پڑا بلکہ اُردو نے ہمیں خود تلاش کرلیا۔کہنے کا مطلب یہ کہ جب جاپانی اُردو کے کرتا دھرتاؤں کو یہ پتا چلا کہ ہم جاپان آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اُردو والا دوسرے اُردو والے کے ساتھ کرتا ہے یعنی فوراً ہمارے خیر مقدمی جلسے کا اہتمام ہوگیا۔اس کے ذمہ دار ہمارے دوست سوزوکی تاکیشی تھے جو ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔اُردو ماحول اور تہذیب میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کاش ہم بھی اردو کے لیے اتنا کچھ کرسکتے''۔[۳۱]

سفر نامہ لکھتے وقت ایک سفر نامہ نگار کو نہ جانے کتنے واقعات کو یکے بعد دیگرے تسلسل سے پیش کرنے کی شعوری کوشش کرنی پڑتی ہے جس کے لیے ذہن کا موزوں ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ کئی اہم واقعات و حادثات کے محو ہوجانے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ موصوف نے جاپان چلو جاپان چلو لکھتے وقت کون سا طریقہ اختیار کیا لیکن اتنی بات تو مسلم

ہے کہ اس سفر نامے میں انہوں نے 'یونیسکو کی چھتری' کا خاکہ بڑے ہی نرالے انداز میں پیش کیا ہے جسے ان کا شاہکار قرار دیا جانا چاہئے۔ اپنی یادداشتوں کو احتیاطاً ڈائری میں نوٹ کر کے رکھا یا خطوط کی تکنیک کے سہارے جس میں سفر نامہ نگار جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے اپنے کسی دوست یا عزیز کو خط لکھ کر بیان کر دیتا ہے۔ ہاں! اس کی ایک مثال یونیسکو کی چھتری کے بیان میں ملتی ہے جس میں انہوں نے خاکے کا انداز بھی اختیار کیا ہے جو کہ غیر شخصی خاکے کے ضمن میں آتا ہے۔ اس موقع پر ان کا فن اپنے عروج پر ہے جس میں انہوں نے جاپان میں ملی چھتری کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ ان کی شریک حیات کو غلط فہمی ہوگئی اور انہیں فون پر سخت وسست سننی پڑی بلکہ کئی ضروری باتیں کرنے کے مواقع بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ یہاں انہوں نے اپنی شریک حیات (مکتوب علیہ) کو بالواسطہ طور پر اپنا ہم سفر بنالیا ہے۔ اس طریقۂ کار میں ایک خامی یہ ہے کہ ایسا کرتے وقت تاثرات میں وہ تازگی اور بے ساختگی باقی نہیں رہتی جو سفر نامہ نگار کے دل و دماغ پر مرتسم ہوتی ہے اور جس سے وہ براہ راست دوچار ہوتا ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے اس تکنیک کو بڑے ہی عمدہ انداز میں استعمال کیا ہے اور کسی قسم کی خامی کو نہیں پیدا ہونے دی ہے۔

''وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی روز اپنی بیوی کو خط لکھا۔ وہ ہمیں آج ملی ہے، دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں۔ اسی کے سائے میں رہنا ہے''۔

''آٹھ دن بعد ہم اپنے ہوٹل میں گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ نیند سے جاگ کر فون کا ریسیور اٹھایا تو پتا چلا کہ ہندوستان سے فون آیا ہے، دوسری طرف سے ہماری بیوی کی آواز آئی تو ہم نے بے ساختہ پوچھا ''ہیلو کیسی ہو؟ خیریت سے تو ہو نا؟ ہماری بیوی نے کہا ''میری خیریت جائے بھاڑ میں پہلے یہ بتاؤ' اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے۔ ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ کون؟ میں تو کمرہ میں اکیلے رہتا ہوں' کیسی باتیں کرتی ہو میری غریب الوطنی کا تو لحاظ کرو' پھر ایسی باتیں کرنے کے لیے کئی سمندر پار سے فون ملانے کی کیا

ضرورت ہے''۔ بولیں ''یہ تمہاری آواز میں اتنا خمار کیوں ہے؟ ایک عجیب سی مستی کیوں ہے؟'' ہم نے کہا۔ ''رات کا ڈیڑھ بجا ہے' تمہارے فون کی گھنٹی پر جاگے ہیں' گہری نیند میں کیا اتنا خمار اور اتنی مستی بھی نہ آئے گی''۔ بولیں! بالکل غلط اس وقت تو رات کے صرف دس ہی بجے ہیں۔ ہم نے بات کو کاٹ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے ہندوستان میں دس بجے ہوں گے مگر یہاں تو رات کا ڈیڑھ بجا ہے''۔ بولیں۔ ''مجھے معلوم ہے کہ اب تمہارا وقت اور میرا وقت کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا' تمہارے لہجے کی سرشاری بتارہی ہے کہ وہ چنڈال اب بھی تمہارے کمرے میں ہی ہے''۔

ہم نے غصے سے کہا۔ ''یہ کیا مذاق ہے۔ تم کس چنڈال کا ذکر کررہی ہو' جاپان میں کوئی چنڈال ونڈال نہیں رہتی''۔

بولیں۔ ''اب تو تم ادھر ہی کے گن گاؤ گے' اسی لیے تو میں تمہارے جاپان جانے کی مخالف تھی' سچ بتاؤ وہ کون ہے جس کے بارے میں تم نے خود اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ تمہیں ٹوکیو میں دوسرے دن ہی مل گئی تھی۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے اور یہ کہ اب تمہیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں۔ ہم نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تم سچ مچ بڑی بھولی ہو۔ ٹوکیو میں ہمیں دوسرے دن جو ملی وہ کوئی حسینہ نہیں بلکہ یونیسکو کی چھتری ہے۔ رو میں ہم شاید چھتری لکھنا بھول گئے اور تم نے اس کا رشتہ عورت سے جوڑ دیا۔

پوچھا۔ ''اچھا تو یہ چھتری ہے''۔ ہم نے کہا اور کیا۔ پوچھا ''اچھا یہ بتاؤ چھتری شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ''؟ ہم نے کہا۔ ''بھلا چھتریوں کی بھی کہیں شادی ہوتی ہے؟ بولیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ عمر کیا ہے؟ ہم نے کہا۔ ''بڑی پرانی چھتری ہے' اس سے پہلے بھی کئی لوگ اسے استعمال کرچکے ہیں؟ بولیں ''اے ہے۔ کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کرو' اب تمہیں کون سی غیر مستعملہ چیز ملے گی۔ مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسی جل جاتی ہے' پر بل نہیں جاتا۔ پھر اپنے لہجے میں غمگینی

اور رقت طاری کرتے ہوئے بولیں ۔خدا کے لیے راہ راست پر آجاؤ
'تمہاری اولاد اب شادی کے قابل ہو رہی ہے اور تمہیں اب بھی نئی نئی
چھتریوں کی تلاش ہے--- ہم نے کہا۔'' تمہارا الزام بالکل غلط ہے' یہاں
کوئی ایسا سلسلہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے خط میں جس کا ذکر کیا ہے' وہ سچ مچ
چھتری ہے' کہو تو تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں جسے میں نے ہمیشہ عزیز رکھا
ہے--- بولیں ۔'' اچھا میرے سر کی عزت کرتے ہو' تبھی تو میرے سر پر
ایک نئی چھتری لا رہے ہو''۔ ۳۲

مجتبیٰ حسین کے اس سفر نامے میں ان کے اسلوب کی تمام خصوصیات یکجا ہوگئیں
ہیں۔ جسے وہ اپنے مزاحیہ کالموں' مضامین اور خاکوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً لطیفہ سازی'
روزمرہ کے محاوروں اور ضرب المثل کا استعمال وغیرہ وغیرہ ان کے علاوہ ان سفر ناموں
میں تشبیہات واستعارات کے خوب صورت نمونے' لفظوں کو فن کارانہ انداز سے برتنے کا سلیقہ
'زبان پر دسترس وغیرہ بھی جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دیکھیں چند اقتباسات جو میرے نقطۂ نظر کی
وضاحت میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں۔

''چوں کہ ہانگ کانگ کی بندرگاہ فری پورٹ ہے۔اس لیے ہر کوئی
منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ یہاں ہر چیز بکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست اپنا
تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو سال پہلے ہانگ کانگ کے ایک ڈیپارٹمنٹل
اسٹور میں سامان خریدنے گئے۔ چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیکھیں۔کوئی شئے
پسند نہ آئی' اچانک سیلز گرل پر نظر پڑی تو وہ پسند آگئی لہٰذا سیلز گرل کو خرید کر
لے گئے''۔

''شاپنگ کے میدان میں ہمارا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے' لہٰذا دوکان
کے سامنے یوں کھڑے رہے جیسے بین کے سامنے بھینس کھڑی ہوتی
ہے''۔ ۳۴

''جاپانیوں کو اندھیرے سے بہت نفرت ہے' لہٰذا اپنی سڑکوں اور
گھروں کو اتنا روشن رکھتے ہیں کہ آدمی کو اپنی روشنی طبع کا استعمال کرنے کی
ضرورت ہی پیش نہیں آتی''۔ ۳۵

''جب ہم اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تو مس پرینا نے انگریزی آداب کے مطابق ہم سے کہا کہ آج رات کوئی اچھا سا خواب دیکھیے۔ ہم نے کہا مس پرینا کیا کریں کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔''[۳۶]

مندرجہ بالا تحریر سے یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ ان کا اسلوب دل پذیر اور تبسم آفریں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی اور عام حالات میں بھی مضحک پہلو تلاش کر لیتے ہیں جس میں ان کے فن کا انوکھا پن اور تازگی نہایت اہم رول ادا کرتا ہے اور ہم موصوف کے طنز کی شگفتگی، برجستگی اور ان کے حس مزاح کے قائل ہو جاتے ہیں، اس کی واضح مثال اس وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب وہ اپنے ملک کے مزاج اور حالات وغیرہ کا مقابلہ دوسرے ملک سے کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں بہترین طنز وہ ہے جس کا ہدف خود کو بنایا جائے اور بہترین مزاح وہ ہے جس میں مزاح نگار اپنا مذاق آپ اُڑائے۔ ملاحظہ فرمائیں ایک جاپانی خاتون سے مجتبیٰ حسین کی بات چیت پر مبنی ایک اقتباس جس میں موصوف نے ہندوستانی لوگوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔

ایک جاپانی خاتون مجتبیٰ حسین سے کہتی ہیں۔ ''ہمارے یہاں عمارتوں کو تصنیف و تالیف کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ آپ کے یہاں تو یہ رواج ہے کہ جہاں کہیں کوئی تاریخی عمارت دیکھی اس پر اپنا نام لکھ دیا۔ میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام محض اس لیے لکھا تھا کہ وہاں چار پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، میں نے سوچا شاید ان کے یہاں ایسا کرنے کا دستور ہے''۔[۳۷]

مندرجہ بالا عبارت کے پس منظر میں مجتبیٰ حسین کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر شکیل الرحمان۔ اپنی تصنیف ''مجتبیٰ حسین کا فن'' میں رقم طراز ہیں:

''مجتبیٰ حسین کے فن کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی ماحول کے خاص لمحوں کو گرفت میں لے کر ان لمحوں کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی خاص لمحوں کی سنجیدگی اور بزرگی کو مضحک بنا دیتے ہیں''۔[۳۸]

اس سفرنامے میں ہمیں مندرجہ بالا دونوں خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سنجیدہ صورت حال کو مزاحیہ رنگ دینے کی مثال سفرنامے کے شروع ہی میں ملتی ہے جب انہوں نے حسب معمول اور خلاف معمول، درآمد اور برآمد کی تکرار سے مزاحیہ پہلو پیش کیا ہے اور پھر آگے چل کر عمارتوں پر نام کندہ کرنے کی عادت کو اپنی گرفت میں لے کر مزاح پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے اغراق سے فضا کو ایسی مضحکہ خیزی عطا کر دی ہے جس میں لطیفے کی سی برجستگی اور شگفتگی شامل ہو گئی ہے۔ اپنے اس سفرنامے میں موصوف نے طنزیہ اسلوب کے بھی حربوں سے بخوبی فائدہ اٹھایا ہے۔ کبھی الفاظ کو مرکز بنا کر، کبھی ان میں تراش خراش کر کے، کبھی لطائف اور واقعہ نویسی کے سہارے تو کبھی محاوروں اور ضرب الامثال کے ذریعہ۔ انہوں نے مشہور مصرعوں اور اشعار کا بھی استعمال کیا ہے اور اسے اپنے موافق ڈھال لینے میں کامیاب رہے ہیں جس کی مثالیں آپ اس سفرنامے کے مطالعے کے وقت دیکھ سکتے ہیں مثلاً اس سفرنامے کے صفحہ ۲۷ پر ہینڈ بیگ کو ہینڈ بیاگ، صفحہ ۴۷ پر کیلکو لیٹر کو کیا لکو لیٹر لکھ کر حیدرآبادی لہجہ کا نمونہ پیش کیا ہے لیکن اس کے در پردہ حیدرآبادی لہجہ میں اصلاح کی کوشش کارفرما ہے۔ اسی طرح منہ اٹھائے چلے آنا صفحہ ۲۳ ایک تیر سے دو شکار کرنا صفحہ ۵ وغیرہ پر محاوروں کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ یہ محاورے نفس موضوع سے مطابقت پیدا کرنے لگے ہیں۔ ضرب المثل میں تحریف کی مثال صفحہ ۲۳ پر ملتی ہے جہاں بھینس کے آگے بین بجانے کے بدلے بین کے سامنے بھینس کھڑی کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے صفحہ ۱۴۹ پر یہ مصرع لکھا ہے۔ ''شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو'' جو نفس مضمون سے مطابقت رکھتا ہے یا پھر مندرجہ ذیل اشعار جسے انہوں نے سفرنامہ میں بخوبی برتا ہے جس سے ان کی کلاسیکی شعروادب سے واقفیت اور اس پر دسترس کا علم بھی ہوتا ہے۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ۳۹

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں ۴۰

سفرنامہ نہ تاریخ ہوا کرتا ہے نہ محض جغرافیہ اور نہ ہی محض خالص ادب۔ بلکہ یہ ان سب کی ایک ملی جلی شکل ہوا کرتا ہے ایک ایسی حسین شکل جس میں دیگر نصابی علوم کے مثل تمام

چیزیں ذہن نشین نہیں رکھنا پڑتیں بلکہ سبھی چیزیں خود بہ خود یاد رہ جاتی ہیں۔ شاید دنیائے علم و ادب میں سفرنامے کی اہمیت اسی وجہ سے ہے کیوں کہ اس صنف نے جہاں زبان و بیان کو وسعت بخشی ہے وہیں علم کے دامن کو بھی وسیع کیا ہے۔ سفرنامہ لکھنے والا پیشے کے اعتبار سے خواہ صحافی ہو، سرکاری ملازم ہو کہ تاجر یا پھر عام سیاح ہی کیوں نہ ہو سبھی اپنے اپنے احساسات، تاثرات کا اظہار اپنے مخصوص زاویہ نظر سے کرتے ہیں اور اس طرح ایک قابل قدر تصنیف کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ آج جب کہ ہم گلوبل ولیج میں زندگی گزار رہے ہیں، یہ وسیع و عریض دنیا سمٹ کر اس قدر چھوٹی ہوگئی ہے کہ ہم منٹوں بلکہ سکنڈوں میں اپنے پیغامات ایک دوسرے کو ارسال کر دیا کرتے ہیں۔ اس طرح سفر کے مراحل بھی ماضی کے مقابلے میں اب نہایت آسان و آرام دہ ہوگئے ہیں، فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں یعنی پورا کرۂ ارض سمٹ کر عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر گیا ہے اور سیر و سیاحت کے علاوہ لاکھوں کروڑوں لوگ تلاش معاش کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے ہیں اور ان میں بہت سے اصحاب ایسے بھی ہیں جو کہ اپنے تاثرات و تجربات سفرناموں کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں جس سے ہم مختلف ملکوں کی طرزِ معاشرت، تہذیب و ثقافت، موسیقی و فنون لطیفہ، صحافت و سیاست، سائنسی صنعتی و طبی ایجادات و دیگر افکار و نظریات وغیرہ سے روشناس ہوتے ہیں، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان سفرناموں کا تعلق محض ماضی کی یادوں سے نہیں ہوا کرتا بلکہ اس میں حال اور مستقبل کے اشاریے بھی نظر آتے ہیں جس کی حیثیت رواں تبصرے کی ہو جاتی ہے جو ہمیں حقیقت حال سے آشنا کرانے میں کامیاب رہتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا دوسرا سفرنامہ سفر لخت لخت بھی اسی قبیل کا سفرنامہ ہے جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا اس میں انہوں نے لندن، پیرس، جدہ، تاشقند اور سمرقند و بخارا کا ذکر کیا ہے اور قاری کو ان حقیقتوں سے آگاہ کرانے کی کوشش کی ہے جو انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر حاصل کی تھیں۔ اس سفرنامے کو پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس شدت سے ہوتا ہے کہ یہ سفرنامہ کم اور مسافر نوازی زیادہ ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے کتاب کے حرف آغاز ''دو باتیں'' میں کر دیا ہے؛

> ''ہمیں یہ بکھرے سفرنامے اس لیے پسند ہیں کہ ان میں بعض کردار اور شخصیتیں محفوظ ہوگئیں ہیں۔ انہیں ملکوں کے حال کے طور پر نہیں بلکہ ان

انسانوں کے ذکر کے طور پر پڑھا جائے جو ان ملکوں میں آباد ہیں۔ ملکوں ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ملکوں اور جغرافیائی حالات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اصل اہمیت ان انسانوں کی ہے جو ان ملکوں میں آباد ہیں''۔[41]

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں نہ کہ سفرنامہ نگار لیکن ''جاپان چلو، جاپان چلو'' کی مقبولیت نے انہیں سفرنامہ نگار بھی بنا دیا۔ ''سفر لخت لخت'' کے مضامین مجتبیٰ حسین کے شگفتہ اسلوب کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں جس میں طنز و مزاح کے عناصر جابجا بکھرے پڑے ہیں۔

''ہمیں لندن کی ان تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کی تمنا ہے جہاں بیٹھ کر انگریزوں نے اپنی تاریخ تو بنائی مگر دوسروں کا جغرافیہ بگاڑا''۔[42]

وہ برطانوی اور ہندوستانی شاعروں کے فرق کو بڑے نرالے انداز میں واضح کرتے ہیں۔ دیکھیں یہ اقتباس جس سے ان کے اسلوب اور لہجے کی انفرادیت بھی ظاہر ہوتی ہے:

''برطانیہ کے اردو شاعر ہمارے شاعروں کی طرح ہمہ وقتی شاعر نہیں ہیں بلکہ ہفتہ کے پانچ دن سچ مچ کام کرتے ہیں۔ البتہ جمعہ کی شام سے اتوار کی رات تک ''عرض کیا ہے'' اور ''ذرّہ نوازی کا شکریہ'' وغیرہ میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں خدانخواستہ کسی شاعر کا کلام اچھا ہو تو مشاعرہ میں شرکت کے لیے رکشا کا کرایہ مانگ لیتا ہے۔ برطانیہ کا اُردو شاعر رکشا کا کرایہ نہیں مانگتا بلکہ اپنی موٹر میں جاتا ہے چاہے اس کا کلام اچھا ہی کیوں نہ ہو''۔[41]

اس امر سے ہم بھی واقف ہیں کہ سفرنامہ بیانیہ صنف ادب ہے جو کسی خاص تکنیک یا اصول کی پابند نہیں ہوا کرتی بلکہ سفرنامہ نگار کا مزاج اور اسلوب نگارش ہی اس خاص سفرنامے کا اصول وضع کرتا ہے۔ جیسا کہ اس سفرنامے سے بھی ظاہر ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے میں نہایت آزادانہ طور پر اپنے احساسات و تجربات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے اور اسے ناول، افسانہ یا داستان بننے سے بچالیا ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ اپنے سب سے مضبوط حربے یعنی خود کو مرکزی کردار بنا کر مزاحیہ فن پارہ تشکیل دینے کا جوہر دکھایا ہے۔ جس میں وہ واحد متکلم کی شکل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اپنی روداد سفر بیان کرتے ہوئے اپنے باطن میں چھپی ہوئی

حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سفر نامہ جاپان کے بعد مجتبیٰ حسین کے نوک قلم سے نکلے اس دوسرے سفر نامے نے مزاحیہ سفر نامہ نگاری کے فن کو نئی نئی جہتوں سے ہم کنار کیا ہے اور اسے مزید معتبر اور قابل پذیرائی صنف بنا دیا ہے۔ اس سفر نامے میں بھی انہوں نے پہلے سفر نامے کی طرح ادب، تاریخ، سماج اور انسان کو ہی موضوع بنایا ہے اور اکثر و بیشتر طنز معکوس کے ذریعہ حقیقت آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ ''سفر لخت لخت'' کے تمام سترہ ابواب کے عنوانات بھی کچھ اس انداز سے بنائے گئے ہیں کہ اسے بے ساختہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے مثلاً سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی جہاز میں، لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں، برطانیہ میں دھوم ہماری زباں کی ہے، دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ وغیرہ وغیرہ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں جس سے ہمارے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

> ''برطانیہ کے اردو شاعر اور ادیبوں کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے اندر حسد، رقابت، غیبت اور معاصرانہ چشمک جیسے ضروری جذبوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے یوں بھی ان ضروری جذبوں کے بغیر اُردو تہذیب کا تصور نہیں کیا جا سکتا''۔ ۴۲

لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ کے حوالے سے مصنف کی یہ عبارت دیکھیں جس میں ان کے اندر کا حساس فن کار اپنے کرب کا اظہار بھی کرتا نظر آتا ہے۔

> ''دو ایک جگہ ہیتھرو ایرپورٹ پر اردو میں بھی مسافروں کے لیے ہدایت نظر آئیں کہ ایرپورٹ کو صاف ستھرا رکھیے یعنی سگریٹ کے ٹکڑے نہ پھینکو، مونگ پھلی کے چھلکے نہ بکھراؤ، براہ کرم اپنا تھوک اپنے منہ میں ہی رکھو وغیرہ وغیرہ، اس طرح صفائی کے تعلق سے اردو والوں کی شہرہ آفاق عادات و اطوار کو دنیا والوں پر اجاگر کرنا تھا ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس غیر ضروری ہدایت کو چھوڑ کر بقیہ ساری ضروری ہدایتیں اُردو میں درج نہیں تھیں''۔ ۴۳

ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس جس میں انہوں نے سویت یونین کے ادبی اشاعتی مرکز کے شعبہ اردو کے ایڈیٹر غفور جہاں گستری (جن کے ذمہ مجتبیٰ حسین کی میزبانی کے فرائض تھے) کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ قاری کو سفر نامے کے ساتھ ساتھ خاکے کا بھی لطف حاصل

ہو جاتا ہے اور غفور جہاں گستری کی پوری شخصیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے:

''جتنی مشکل اردو وہ بولتے تھے اتنے ہی سادہ انسان وہ ہمیں نظر آئے جیسا کہ عام طور پر غفورے ہوتے ہیں۔ نہایت معصوم، مخلص، محنتی اور شریف''۔ ۴۴

''اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ ازبکی زبان میں کوئی ہم سے بات کرتا تو غفور جہاں گستری طلسم ہوشربا والی اُردو میں اس کا ترجمہ خود ہمارے سامنے کرتے اور بعد میں ہم غفور جہاں گستری کی اردو کا ترجمہ خود اپنی اُردو میں اشتیاق عابدی (رفیق سفر) کے لیے کرتے تھے۔ اردو کے ایسے مشکل، ثقیل اور متروک الفاظ جنہیں ہم نے کہیں نہ سنا' نہ پڑھا نہ لکھا انہیں غفور جہاں گستری کی وساطت سے ازبکستان میں سننے اور برتنے کا موقع ملا۔ ان سے مل کر نہ صرف اردو کا مستقبل روشن نظر آیا بلکہ اس کا ماضی تو اتنا روشن نظر آیا کہ ہماری بصیرت اور بصارت دونوں چکاچوند ہو گئیں۔'' ۴۵

غفور جہاں گستری کی طلسم ہوش رُبا والی اُردو کی چند مثالیں دیکھیں جس میں فارسی الفاظ کی بہتات ہے۔

''بولے مہمان گرامی! اس حقیر فقیر بندہ پر تقصیر کے نام کے اسرار و رموز کو جاننے میں آپ اپنی حیات جاودانی کی عزیز ساعتیں اور بیش بہا ذہانتیں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ناچیز کو صرف غفور کہیے''۔ ۴۶

''آپ نے اُزبیکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت و توقیر میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لیے میں سالم و کامل صمیم قلب کے ساتھ آپ کی خدمت اقدس میں اپنے شخصی اور بالخصوص اُزبیک عوام کے عمومی جذبات و تہنیت و تشکر و تبریک پیش کرتا ہوں۔۔۔

''گر قبول اُفتد زہے عز و شرف''

''آپ پر یہ حقیقت کیسے منکشف ہوئی کہ خاکسار فیض احمد فیضؔ کی دل نواز صحبت خاص سے مستفیض و فیض یاب ہو چکا ہے۔'' ۴۷

ایک سفرنامہ نگار کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے سفرنامے میں جغرافیائی حدود' تاریخی

حقائق وغیرہ کو پیش کرے بلکہ اسے تو وہاں کے انسانوں کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنا' ان کے سماجی عادات واطوار کا مشاہدہ کرنا اور ان کی نفسیاتی کمزوریوں کو محسوس کرنا ہوتا ہے یعنی ایک سفرنامہ نگار کا کام ان خیالات' کیفیات' مشاہدات' تجربات وغیرہ کا بیان ہے اور یہی اسے ایک اچھے ادیب کے زمرے میں لاکھڑا کرتا ہے کیوں کہ اگر یہ ساری چیزیں نہ پائی جائیں تو وہ قاری کو اپنا ہم سفر نہیں بنا سکتا اور اگر وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے تو اسے چاہئے کہ وہ انشائیہ لکھے' افسانہ قلم بند کرے' یا ناول تحریر کرڈالے کیوں کہ سفرنامہ نہایت ہی سچا اور عظیم ادب ہے جس میں حقائق منکشف ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس میں تجسس' تحقیق اور تفریح کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔''سفر لخت لخت'' ادیب وصحافی مجتبیٰ حسین کے ذریعہ لکھا گیا دوسرا سفرنامہ ہے۔جس میں ہمیں خوشی کی لہر' تحیّر کی تازگی' نیا پن' مروت' مہمان نوازی' بے نیازی اور اسی قسم کے دیگر جذبات واحساسات کا گمان ہوتا ہے۔اس سفرنامے میں انہوں نے اپنے پہلے سفرنامہ کی مانند مزاحیہ اسلوب کی ان تمام خوبیوں کو اپنایا ہے جس سے یہ سفرنامہ قابل قدر فن پارہ بن گیا ہے۔اس سفرنامے میں انہوں نے کئی جگہ اشعار' مصرعوں اور لطیفوں کا سہارا لے کر بات کہنے کی کوشش کی ہے اور کئی جگہ تو تحریف کے گر بھی آزمائے ہیں اور کبھی کبھی تشبیہ و استعارہ' رمز واشارہ' ایہام وابہام سے بھی کام لیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔چند مثالیں جن سے مندرجہ بالا نکات پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

''آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی''۔[۴۸]

اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہیں''[۴۹]

''جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ''[۵۰]

''چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں''[۵۱]

مجتبیٰ حسین نے اپنے اس سفرنامے میں کئی مقامات پر صرف ایک کام کا جملہ لکھنے کے لیے ایک پورا پیراگراف بلکہ لطیفہ لکھ ڈالا ہے۔میرے خیال میں انہوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے جس سے ان کا فن مجروح نہیں ہوتا کیوں کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور رعایت لفظی سے کام لیتے تو ان کی تحریر سپاٹ ہو جاتی جو قاری کے لیے حقیقت حال جاننے کا باعث تو ہو سکتی تھی' لطف وانبساط اور حظ حاصل کرنے کا ذریعہ ہرگز نہیں۔ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس:

''ایک اُزبکی اپنے چھوٹے بچے کو لے کر بخارا کی سیر کرنے گیا۔ بخارا کے مشہور کلاں مینار کے قریب یہ دونوں پہنچے تو بچے نے دیکھا کہ اس مینار کے سب سے اوپری حصہ پر ایک پرندے نے اپنا گھونسلہ بنا رکھا ہے۔ باپ مینار کی تاریخ بیان کرتا رہا لیکن بچہ متواتر اس پرندہ کو دیکھتا رہا جب باپ نے مینار کی تاریخ بیان کر دی اور واپس جانے کا وقت آیا تو بچے نے باپ سے کہا! ''ازبکستان کے رہنے والے بھی بڑے بیوقوف ہیں۔ ایک معمولی سے پرندے کے رہنے کے لیے اتنا بڑا مینار تعمیر کر دیا۔[۵۲]

مجتبیٰ حسین کے دونوں سفر نامے جاپان چلو' جاپان چلو اور سفر لخت لخت مندرجہ بالا کسوٹی پر کھرے اُترتے ہیں جس کا ''میں'' شاہد بھی ہے اور *Narrator* بھی جبھی تو اسے پڑھتے وقت ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سفر نامہ نگار کے ساتھ ساتھ سفر کے مرحلوں اور منزلوں سے ذاتی وابستگی محسوس کر رہے ہیں یعنی ان سفر ناموں میں مجتبیٰ حسین ایک ایسے فن کار کی شکل میں ابھرتے ہیں جو قاری کو بھی اپنے ساتھ سیر کراتا ہے اور اسے اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوتا کہ وہ خود شریک سفر نہ تھا یعنی ان کے سفر ناموں میں بوجھل پن کا کہیں گزر نہیں جو اچھے سفر نامے کی ایک بڑی خصوصیت ہوتی ہے۔ ان دونوں سفر ناموں میں نہ ہی کسی رومانی داستان کا عنصر ہے نہ ہی حادثاتی معروضات کا یا پھر مہم جوئی کا ایسا خیالی عنصر جس میں آرائش بیان پر زور دیا گیا ہو بلکہ ان سفر ناموں میں ایسے مسافر کی روداد ہے جسے اس نے اپنی چشم شوق سے دیکھا اور پرکھا ہے اور ان واقعات کو صفحہ قرطاس پر کچھ اس انداز سے منتقل کر دیا ہے جیسے کوئی شخص اپنی خوش گوار یادوں کو رقم کرتا چلا جا رہا ہو۔

ان سفر ناموں میں سفر نامے کا ''میں'' مرکزی کردار کی شکل میں اُبھرتا ہے جو مجتبیٰ حسین خود ہیں جنہیں منظر اور پس منظر دونوں کے بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ان سفر ناموں میں ان کے دلکش اسلوب نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے اور وہ اپنے تجربات' مشاہدات و محسوسات کے امتزاج کے ذریعہ جانے انجانے ایک ایسا ادب تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کی قدر و منزلت دنیائے ادب میں مسلم ہو گئی ہے۔ شاید انہیں خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے نامی انصاری نے لکھا ہے کہ:

''ابن انشا اس خاص صنف ادب کے پیش رو ضرور ہیں مگر میں سمجھتا

ہوں کہ مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ سفرنامہ نگاری کے فن کو نئی جہتوں سے ہم کنار
کر کے اسے اور زیادہ معتبر اور قابل پذیرائی بنادیا ہے''۔ ۵۳

ایک سفرنامہ نگار کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی چاہئے کہ اس کی نثر دلکش ہو' مشاہدہ عمیق ہو اور جس طرح وہ سفر سے لطف و انبساط حاصل کرتا ہے' قاری کو بھی برابر کا شریک بنانے کے ہنر سے واقف ہو' ان سب چیزوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ مصنف میں مرقع کشی کی بے مثل صلاحیت پائی جاتی ہو اور اسے لفظوں کو سلیقے سے برتنے کا ہنر بھی معلوم ہو۔ ساتھ ہی وہ زبان و بیان پر بھی قدرت کاملہ رکھتا ہو تب کہیں جا کر وہ سفرنامے کے مجموعی تاثر میں حیرت انگیز جاذبیت اور کشش پیدا کر سکے گا۔ جس پر مجتبیٰ حسین قادر نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ دی رینڈم ہاؤس ڈکشنری آف انگلش لنگویج				
۲۔ ویبسٹر ڈکشنری				
۳۔ کیمبرج انٹرنیشنل ڈکشنری آف انگلش				۱۹۸۸ء
۴۔ ویبسٹر نیو ورلڈ ڈکشنری آف امریکن انگلش				
۵۔ قطب النساہاشمی				
۶۔ آغا محمد طاہر	سیر ایران (دیباچہ)			
۷۔ ڈاکٹر انور سدید	اردو ادب میں سفرنامہ			
۸۔ ڈاکٹر سید عبداللہ				
۹۔ مرزا حامد بیگ				
۱۰۔ تحسین فراقی	عجائبات فرنگ (دیباچہ)		۱۸۷۳ء	
۱۱۔ مجتبیٰ حسین	جاپان چلو جاپان چلو حسامی بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۸۳ء			
۱۲۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۳۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۴۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۵۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۶۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۷۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۸۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۹۔ ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۲۰۔ شگوفہ جلد ۲۰	مجتبیٰ حسین نمبر	حیدر آباد نومبر ۱۹۸۷ء		
۲۱۔ مجتبیٰ حسین	جاپان چلو جاپان چلو حسامی بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۸۳ء			

۲۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۲۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۲۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۲۵۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۲۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۲۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۲۸۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۲۹۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۰۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۵۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۳۷۔شکیل الرحمٰن	مجتبیٰ حسین کافن	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۸۷ء			
۳۸۔مجتبیٰ حسین	جاپان چلو جاپان چلو حسامی بک ڈپو ۱۹۸۳ء				
۳۹۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۰۔مجتبیٰ حسین	سفر لخت لخت	حسامی بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۹۵ء			
۴۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۵۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۶۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۷۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۸۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	
۴۹۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	

۵۰۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۵۱۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۵۲۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۵۳۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۵۴۔ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً

۵۵۔نامی انصاری آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح' معیار پبلی کیشنز' دہلی دسمبر ۱۹۹۷ء

مجتبیٰ حسین کی فنی وفکری انفرادیت

گزشتہ ابواب کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اپنے فرضی نام 'کوہ پیما' سے مزاح نگاری کے میدان میں کوہ پیمائی شروع کی جو آج بھی نہایت آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ ان کا مزاحیہ سفر حیدرآباد سے شائع ہونے والے مشہور روزنامہ 'سیاست' سے شروع ہوا' جو کالموں' مزاحیہ مضامین' خاکوں اور سفرناموں کے اردگرد پھیلا ہوا ہے اور یہ پیغام دینے میں کامیاب ہے کہ مجتبیٰ حسین کسی مخصوص دائرے میں محدود نہیں کئے جاسکتے کیوں کہ ان کا مزاح ان تمام عناصر کا مرہون منت ہے جو اس فن کی خوبی شمار کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاحیہ شہ پاروں کو پڑھتے وقت ہمیں پطرس بخاری' رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کی اس خوب صورت روایت کا احساس ہوتا ہے جو مسرت و انبساط کا سرچشمہ ہے۔

مجتبیٰ حسین اپنی صحافتی زندگی سے یکا یک ۱۲/اگست ۱۹۶۲ء کو مزاحیہ کالم نگاری کی جانب چلے آئے اور اسی دن سے اپنی تخلیقات کے ذریعے ہزاروں قارئین کے ذہنوں کو غور وفکر کی جانب توجہ مبذول کرانے میں اور اس روایت کو پروان چڑھانے کی حتی المقدور کوشش میں مصروف ہیں' جسے اودھ پنچ نے شروع کیا تھا۔ وہ روز اول سے ہی اپنے اشہب قلم سے سماج و معاشرہ میں موجود ان تمام موضوعات کا احاطہ کرنے میں پیش پیش ہیں جن پر عام قاری کی نظر بہ مشکل ہی پڑتی ہے یا اگر وہ ان موضوعات سے روبرو ہو بھی جاتا ہے تو بھی اسے درگزر کر دیتا ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین ایک ایسے فن کار ہیں جنہوں نے ان موضوعات کو بھی ہدف طنز و مزاح بنایا

ہے اور ان حالات، واقعات و حادثات کو بھی، جس سے سماجی، سیاسی، معاشی سبھی سطحوں پر فائدہ اٹھایا جاسکے اور ایک قسم کی بیداری لائی جاسکے۔ انہوں نے اپنے کالموں کو مقصدیت و افادیت، کا ترجمان بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع، وسعت اور سماجی شعور ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ بہت حساس ذہن کے مالک ہیں اور انہیں ادب کی کلاسیکی قدروں سے بھی واقفیت ہے جن کے سہارے وہ اپنی تخلیقات میں حسن و جاذبیت پیدا کر دیتے ہیں۔ شاید یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ان کے کالموں میں ایک قسم کی ادبی اور تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کسی بھی واقعے یا حادثے کو تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں جس میں ہلکے ہلکے طنز و مزاح اور میٹھے میٹھے مزاح کی آمیزش ہوتی ہے جس سے قاری لطف اندوز تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی اس کے اندر ایک قسم کا مثبت رویہ بھی پروان چڑھتا ہے۔

اگر ان کے کالموں کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے کالموں میں بھی مزاحیہ اسلوب کے وہ تمام حربے مثلاً حسنِ بیان، واقعہ نویسی، لطیفہ گوئی، لطفیہ سازی، تضاد و تناسب، صنائع و بدائع، تشبیہات و استعارات، رمز و کنایہ، ضرب المثل و محاورے، اشعار و مصرعوں وغیرہ کو بروئے کار لاتے ہیں اور مبالغہ آمیزی، تحریف نگاری، رعایت لفظی، تکرار، مضحکہ خیز املا یہاں تک کہ تلفظ کے ذریعے بھی مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ یعنی وہ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے لیے ضروری سبھی حربوں کو کامیابی سے برتنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

ان کی تحریروں میں ایک قسم کا کرب چھپا نظر آتا ہے جس میں اصلاحی جذبہ کارفرما رہتا ہے لیکن ایسا کرتے وقت بھی وہ اپنے کالموں کو مکدر اور نفرت آگیں نہیں ہونے دیتے بلکہ شائستگی سے قریب تر رہتے ہیں۔ ان کے یہاں عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر مثل کندن دمکنے کا نام ہے، نہ کہ کسی کی تضحیک یا دل شکنی کا۔

مجتبیٰ حسین کے کالموں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک ایسے فن کار ہیں جنہیں اپنی بات ایسے منفرد لب و لہجے میں کہنے کا ہنر معلوم ہے جس سے قاری مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور کسی قسم کے بوجھل پن کا احساس کئے بغیر پورے فن پارے کو شروع سے آخر تک پڑھنے پر مجبور نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے کالموں کے

عنوانات مثلاً ہمارے گھر پر چھاپہ' چلو اکیسویں صدی میں' تھوکنا منع ہے' حیدر آبادی کھانوں کا میلہ وغیرہ بھی کافی اہم رول ادا کرتے ہیں کیوں کہ ان میں اتنی بے ساختگی' برجستگی اور دلکشی ہوتی ہے کہ قاری اس سمت کھنچا چلا آتا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ مختلف مواقع پر مختلف حربے اپناتے ہیں مثلاً کبھی تو ایک ہی لفظ کو مرکز بنا کر کالم کی پوری عمارت تعمیر کر دی تو کبھی کبھی رعایت لفظی کے سہارے موضوع اور نفس موضوع میں ایسی جان پھونک دی جس پر حقیقت کا التباس ہونے لگے۔ ایسا کرتے وقت وہ کسی شعوری کوشش کے شکار نہیں ہوتے بلکہ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ حالات خود بہ خود موافق ہوئے جاتے ہیں اور پورا مزاحیہ کالم تسلسلِ بیان کا مرقع بن گیا ہے۔

انہوں نے اپنی طنزیہ مزاحیہ کالم نگاری کے دوران ہی ''ہم طرف دار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں'' کے عنوان سے پہلا مزاحیہ مضمون لکھا اور اس دن سے آج تک اپنے پیش روؤں کے بھرم کو برقرار رکھنے میں نہ صرف کامیاب رہے ہیں بلکہ آج بھی اپنی قہقہہ بدوش تحریروں سے اس صنف میں عمدہ اضافہ بھی کئے جا رہے ہیں۔

ان کے مزاحیہ مضامین دلکش اسلوب لئے ہوتے ہیں جن میں ان کی شرافت' نیکی اور اعتدال پسندی کو بڑا دخل ہوتا ہے جو ان کے حساس ذہن کا رہینِ منت ہے۔ وہ کبھی پابند موضوع نہیں رہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات و حادثات یہاں تک کہ سماج میں موجود مضحکہ خیز کرداروں کو بھی موضوع بنایا اور اس میں اتنی جدت' نیا پن اور رنگا نگی بھر دی کہ قاری مسحور ہو کر زیرلب مسکرانے یا بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے منفرد اسلوب اور لب و لہجے سے خوب فائدہ اٹھایا ہے اور جزئیات نگاری' واقعہ نگاری' خوش طبعی' ظریفانہ واقعہ نگاری بھی سے کام لیا ہے۔ کبھی تو ایسی افسانوی اور ڈرامائی صورت حال پیدا کر دی ہے جس سے قاری ذہنی طور پر رشتہ استوار کر لیتا ہے اور مضامین کے سارے مناظر ذہن کے اسکرین پر اُبھرنے لگتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو سماج سے جوڑ کر دیکھنے کے قائل ہیں' ادب برائے سماج اور ادب برائے زندگی میں یقین رکھتے ہیں نہ کہ تخلیق برائے تخلیق اور فن برائے فن میں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تمام مضامین میں ایک قسم کی تخلیقی فضا پائی جاتی ہے۔ انہوں نے ہنسنے کو ایک مقدس فریضہ گردانا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ناگوار

بلکہ نفرت آگیں حالات میں بھی ہنسنے کے مواقع فراہم کر دیتے ہیں اور ہنسی کے ذریعے سماج کے ان عیوب سے پردہ اٹھا دیتے ہیں جو اس جنت نشان دنیا کے چہرے پر بدنما داغ کے مثل ہے۔ ایسا کرتے وقت طنز کی نشتریت ان کا ساتھ دیتی ہے لیکن ان مواقع پر بھی وہ کسی کی تضحیک نہیں کرتے، کسی کو ہدف ملامت نہیں بناتے بلکہ طنز معکوس کا سہارا لے کر خود کا مذاق اڑاتے ہوئے اپنی بات کہہ جاتے ہیں اور طنز کرتے وقت بھی ابتذال اور پھکڑپن سے کافی دور کھڑے نظر آتے ہیں۔ جو ان کے اندر موجود شرافت، اعلاظرفی اور اپنے ماحول و سماج سے ہمدردی و انسیت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ توڑنے میں یقین نہیں رکھتے بلکہ اصلاح کے خواہاں ہیں، ان کے یہاں ہنسی کا ایک تصور دیکھنے کو ملتا ہے جو غم کو انگیز کر لینے کے بعد ہی وجود میں آسکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ ان کے مزاحیہ مضامین کالموں، خاکوں وغیرہ کو پڑھنے کے بعد قاری نہ صرف ہنستا اور مسکراتا ہے بلکہ یہ سوچنے پر بھی مجبور نظر آتا ہے کہ سماج کے دبے کچلے، مجبور و محکوم انسانوں کو اس کے غموں، مایوسیوں اور محرومیوں سے کیسے نجات دلائی جائے۔

مجتبیٰ حسین کے مضامین میں ایک اچھے اسلوب کی وہ ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں جو طنزیہ و مزاحیہ ادب کے لیے بے حد ضروری ہیں مثلاً موازنہ، مبالغہ، تحریف وغیرہ۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں موازنہ کے فن کو برتتے ہوئے مختلف چیزوں میں بیک وقت مشابہت اور تضاد سے کسی ایسے مضحکہ خیز پہلو کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو قہقہہ برآمد کرنے کے لیے کافی ہے یا کبھی کبھی کسی چھوٹی سی چیز کو اتنی بڑی بنا کر بلکہ بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا کہ وہ مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح تحریف کے فن میں وہ رتبہ و کمال پر فائز ہیں اور نہ صرف اشعار، مصرعوں، ضرب المثل، محاوروں وغیرہ میں تحریف کرتے نظر آتے ہیں بلکہ لطائف و واقعات میں بھی تحریف کر دیتے ہیں جس میں تکرار، رعایت لفظی، مضحکہ خیز املا یہاں تک کہ لفظوں کے تلفظ بھی ذرائع شامل ہیں۔

ایک اچھے مزاح نگار کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ صورت حال سے مزاح پیدا کردے لیکن ایسا کرتے وقت اسے اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ اس کا فن کسی شعوری کوشش کے حصار میں نہ آجائے بلکہ حالات خود بہ خود ایسے بنتے چلے جائیں جو کسی مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کافی ہو۔ یعنی صورتِ واقعہ کی تعمیر میں ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاق وقت (Co-incidence) کو عموماً

بروئے کار لاتا ہے۔ موصوف ان سارے حربوں سے تو کام لیتے ہی ہیں' ان سب کے علاوہ انہوں نے اپنے مضامین میں تشبیہات واستعارات' صنائع و بدائع' رمز و کنایہ' ایہام وابہام کو بھی بہ خوبی برتا ہے۔ انہوں ادبی محاوروں' عام فہم ضرب المثل اور محاوروں' مشہور اشعار یا مصرعوں کے استعمال وغیرہ پر حق تصرف کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے اور موقع بہ موقع اس میں تحریف بھی کی ہے۔ کبھی کبھی تو انہوں نے ضرب المثل اور محاوروں کو ملا کر دو آتشہ تیار کر دیا ہے جو ان کے فن کو آفاقیت بخشنے کے لیے کافی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بذلہ سنجی' لطیفہ گوئی' لطیفہ سازی' مبالغہ' تحریف نگاری' حاضر جوابی' حاضر دماغی اور فی البدیہہ طرز اظہار نے ان کے مزاحیہ مضامین کو لائق صد آفریں بنا دیا ہے۔

گزشتہ ابواب میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ کالم نگاری میں چھ سال کی طبع آزمائی کرنے کے بعد ۱۹۶۸ء میں حکیم یوسف خاں کی فرمائش پر پہلے پہل انہیں کا خاکہ لکھا۔ اس صنف میں دیر سے طبع آزمائی کرنے کی وجہ شاید صرف یہ ہو کہ وہ اس حقیقت سے بہ خوبی واقف تھے کہ خاکہ نگاری کا فن مثلِ مصوری ایک نازک فن ہے۔ اس کے ذریعے شخصیت کا تعارف نہ پیش کر کے قاری کو اس شخصیت کا عرفان بخشنا ہوتا ہے اور یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب قلم نہایت ہی رواں اور بے باک ہو جائے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک لگاتار مزاحیہ کالم اور مضامین لکھنے کے بعد موصوف نے خاکہ لکھنا شروع کیا۔ اس وقت تک ان کے قلم نے کسی شخص کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دہلی' حیدرآباد یا کسی بھی مقام پر کوئی ادبی محفل خصوصاً رسم اجراء ان کے خاکوں کے بغیر نامکمل تصور کی جاتی تھی اور حق تو یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کئی مقامات پر رسم اجراء یا محفلیں ان کے بغیر سونی سونی اور بے جان لگنے لگیں۔ انہیں یہ اہمیت اور مقام دلانے میں ان کے اسلوب نے نہایت اہم رول ادا کیا جس میں کسی قسم کا تصنع' تکلف یا تکبر نہیں ہوتا بلکہ وہ بہ آسانی اپنی بات کہہ جاتے ہیں جو دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔ ان کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں نہ پھکڑپن نظر آتا ہے نہ دل آزاری بلکہ تہذیب و شائستگی اور ایک قسم کا وقار چمکتا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب صاحب قلم ذہین و فطین تو ہو ہی' ساتھ ہی اس کا قلم رواں اور بے باک بھی ہو۔

مجتبیٰ حسین نے تقریباً دو سو سے زائد اشخاص کے خاکے لکھے ہیں جن میں وہ سبھی جیتے جاگتے اور ہنستے مسکراتے ہمارے سامنے نمودار ہوتے ہیں اور وہ ان کرداروں کی زندگی کے

مختلف پہلوؤں پر خوش سلیقگی سے روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے خاکوں میں اس شخص کو ایسے انسان کی شکل میں پیش کرتے ہیں جن کی خوبیوں اور خامیوں سے وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی کی بے جا تعریف سے گریز کرتے ہیں اور اس شخص کی انفرادیت کو دریافت کر کے اسے نہایت ہی واضح شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ حکیم یوسف خاں کے خاکے نے مجتبیٰ حسین کے اندر ایک قسم کی تحریک کو پروان چڑھایا جس کے بعد انہوں نے کئی فرمائشی اور غیر فرمائشی خاکے لکھے لیکن ان خاکوں میں وہ خاکے زیادہ معلوت افزاء' عمدہ اور اہم ہیں جو انہوں نے اپنے اندرونی تحریک سے لکھے ہیں جن میں سجاد ظہیر' ابراہیم جلیس' مخدوم محی الدین' عمیق حنفی وغیرہ کے خاکے شامل کئے جاسکتے ہیں۔ موصوف کے خاکوں کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے ایسے لوگوں کو ہی خاکوں کا موضوع بنایا ہے جو نہایت ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کوئی ادیب' فن کار' عہدیدار یا کوئی ایسا شخص ہوسکتا ہے جو کسی مخصوص مقام پر فائز ہے۔ غیر شخصی خاکوں میں 'یونیسکو کی چھتری' اور محکمہ تعلقات عامہ کی بلڈنگ اہم ہے۔ ان کے خاکوں کو پڑھتے وقت یہ بات شدت سے محسوس کی جاتی ہے کہ موصوف اور موضوع خاکہ دونوں میں کافی گہرا اور قریبی تعلق تھا یا ہے اور وہ انہیں دیکھ' سمجھ اور برت چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان افراد کا ذکر کرتے ہوئے اپنا تذکرہ بھی کرنے لگتے ہیں مثلاً کبھی اپنی عمر کا حساب لگانے لگیں تو کبھی اپنی مالی حالت کا ذکر کرنے لگے' کبھی اپنی نوکری کا ذکر دیا تو کبھی اپنی سکریٹری شپ کا ذکر چھیڑ بیٹھے جو ان کے اس نظریہ کو تقویت بخشتا ہے کہ دوسروں کا خاکہ لکھتے وقت خاکہ نگار کی اپنی شخصیت بھی اس میں در آتی ہے۔ ایسا صرف اس لیے ہوتا ہے کہ خاکہ نگار خود کو موضوع خاکہ کی شخصیت میں ضم کر لیتا ہے تبھی جا کر اچھا خاکہ وجود میں آسکتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ موصوف کے ذریعے تحریر کردہ خاکے ان کے تخلیقی صلاحیت' ان کی ذہنی جودت' ان کی ادبی بصیرت ان کے ویژن اور ان کے اندر موجود فن کارانہ عمل کو تقویت اور جلا بخشتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا سفر کالموں' مزاحیہ مضامین اور خاکوں سے گزرتا ہوا اُس وقت سفرنامے کی جانب گامزن ہوا جب ۱۹۸۰ء میں پہلی بار انہیں جاپان جانے کا موقع ملا۔ اس سفرنامے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں انہوں نے ابتداء سے آخر تک شریفانہ سنجیدگی کو ملحوظ رکھا ہے اور میزبان ملک کی برائی کرنے سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور بڑائی کو بہ خوبی اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان مزاحیہ پہلوؤں کو بھی سنجیدگی سے بیان کر گئے ہیں جن کا فائدہ

اٹھا کر اس ملک اور وہاں کے لوگوں پر طنز کے بھر پور وار کیے جا سکتے تھے لیکن انہوں نے ان مواقع کو بھی بڑے ہی اچھوتے اور دل فریب انداز میں مزاحیہ طور پر بیان کیا ہے اور کسی قسم کی تضحیک و استہزا کو قریب نہ آنے دیا۔

اپنے پینتیس روزہ دورۂ جاپان کا ذکر انہوں نے ''جاپان چلو' جاپان چلو'' میں کیا ہے۔ اس سفرنامے میں جاپان کے متعلق تمام معلومات یکجا کر کے قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس میں وہاں کی تاریخ' ثقافت' جغرافیہ' صنعتی ترقی' ادب' آرٹ وہاں کے لوگوں کے مزاج و خصائل ان کے اندر کے جذبۂ حُب الوطنی' عادات و اطوار یہاں تک کہ کھانے کے آداب' چائے نوشی کے آداب' سلام کرنے کے طریقے' بازاروں کا حال' ہوٹلوں کا ذکر' ین (جاپانی کرنسی) کا حال' بلٹ ٹرین کی تیز رفتاری کا ذکر' جاپان میں اُردو اور اسلام کی حالت وغیرہ تمام موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ پیش کیا ہے جس سے کوئی نو وارد وہاں پہنچ کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مجتبیٰ حسین ایک ایسے فن کار ہیں جو خود کو بھی ہدف بنانے سے نہیں چوکتے اور اس ہتھیار سے وہ ایسی کاری ضرب لگا جاتے ہیں جو غور و فکر کے لیے کافی ہوتا ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے میں بھی اس حربے کو اپناتے ہوئے اپنے براعظم ایشیا کو ہدفِ طنز بنایا ہے جہاں غریبی' تعصب' مفلوک الحالی جیسے نہایت ہی دلدوز مسائل موجود ہیں جن سے عوام اور حکومت دونوں ہی دوچار ہیں۔ ان کا کمال اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے ہنسی ہنسی میں جاپانیوں کی عظمت کا اعتراف کر لیا ہے اور ساتھ ہی اپنے یہاں موجود سماجی عیوب کی نشان دہی بھی کر دی ہے جس میں جرائم کی تعداد' پولیس کا نکما پن' تعصب اور فرقہ وارانہ منافرت کا مسئلہ بھی کچھ شامل ہے۔ اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بھی انہوں نے اپنے اسلوب کے ان مجموعی حربوں کا استعمال کیا ہے جو ان کے فن کو تقویت تو بخشتا ہی ہے' ساتھ ہی ان کے فن پر مہر تصدیق بھی ثبت کرتا ہے۔ ان کے اسلوب کی یہ تمام خوبیاں ان کے دوسرے سفرنامے 'سفر لخت لخت' میں بھی موجود ہیں جو امریکہ' انگلستان' کناڈا' سوویت یونین وغیرہ کے سفر کی داستان ہے۔ اس سفرنامے میں برطانیہ میں اُردو کا حال' افتخار عارف' نقی تنویر' مشتاق احمد یوسفی وغیرہ سے ملاقات کا احوال ہندوستانی ادیب و شاعر حضرات کی حالت زار کا بیان' انگلینڈ کے شعراء و اُدباء سے ان کا تقابل' ازبکستان کے ادیبوں کا ذکر خصوصاً غفور جہاں گستری کی طلسم ہوش رُبا والی زبان کا ذکر بڑے ہی دل فریب انداز میں کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کے ان دونوں سفر ناموں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ ساتھ مختلف مقامات کی سیر کرانے میں کامیاب ہیں۔ ان سفر ناموں کو پڑھتے وقت قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ اس سفر کے مختلف مراحل و منازل سے خود گزر رہا ہے۔ دوران سفر پیش آنے والے مختلف واقعات و حادثات سے ذاتی طور پر وابستہ ہے جس میں موصوف کی گل افشانی گفتار کی خوشبو نے اس کے دل و دماغ کو معطر و سرشار کر دیا ہے۔ مجتبیٰ حسین اسی دنیا کے باسی ہیں جس میں ہم سب زندہ ہیں۔ ان کے گردو پیش کا ماحول بھی وہی ہے جس سے ہم اور آپ دوچار ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دنیا کے مظاہر کو اپنے منفرد ویژن اور زاویہ نظر سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں جسے ان کا شخصی زاویہ نظر کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ماحول سے تاثر پذیری کا بھی جداگانہ انداز رکھتے ہیں جو زندگی کی طرف ان کے ذاتی رویوں کا غماز ہے۔ اپنی طنز و ظرافت کو انہوں نے انہیں شخصی اور ذاتی مشاہدات و محسوسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ جس میں طرفگی کا عنصر ہر جا نمایاں ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مروجہ اور مانوس اسلوب بیان سے بہ خوبی فائدہ اٹھایا ہے اور ہمیں نہ صرف زیر لب تبسم، ہنسی اور قہقہوں کے مختلف مدارج سے گزارنے میں کامیاب رہے ہیں بلکہ غور و فکر کی دعوت بھی دی ہے۔

القصہ مختصر یہ کہ انہوں نے اپنے کالموں، مضامین، خاکوں اور سفر ناموں کے موضوعات کا مواد گردو پیش سے ہی حاصل کیا جس میں ان کے عمیق مشاہدے، واقعات و تجربات کے تئیں محتاط رویئے عقاب نگاہی اور حساس ذہن کے علاوہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور انسان دوستی کے عناصر نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں جس سے وہ اپنے قارئین کے سامنے ایک ایسا فن پارہ پیش کرنے میں کامیاب ہیں جو اپنے اندر بے مثل تازگی اور انوکھا پن لیے ہوتا ہے اور قاری کو مسرت و انبساط سے ہم کنار کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ ناظرین و ناقدین اگر مجتبیٰ حسین کی ان خصوصیات سے لطف اندوز ہونا چاہیں یا انہیں پرکھنا اور سمجھنا چاہیں کہ مجتبیٰ حسین مزاح نگاری کے فن کی کسوٹی پر کتنے کھرے اُترتے ہیں تو انہیں ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں، ڈاڑھ کا درد، سند باد جہازی کا سفر نامہ، ڈائریکٹر کا کُتا، مرزا غالب کی پریس کانفرنس، مرزا کی یاد میں، کچھ پھلوں کے بارے میں وغیرہ مضامین۔ ابراہیم جلیس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین اور کنہیالال کپور کے خاکوں کے علاوہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' اور ''میرا کالم'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ میرا ایقان ہی نہیں بلکہ ایمان بھی ہے کہ ناظرین اور ناقدین کو یقیناً مایوسی نہ ہوگی۔

☆☆☆

مجتبیٰ حسین مشاہیر اور احباب کی نظر میں

کرشن چندر

☆ مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں۔ وہ جوان اور ذہین ادیب ہیں۔ وہ ان مزاح نگاروں میں ہیں جو شائستہ اور نفیس ادب تخلیق کر سکتے ہیں۔ ان کے مزاح میں وہ تندی اور بے باکی نہیں جو طبیعت کو مکدر کر دیتی ہے بلکہ وہ رچاؤ اور لطافت ہے جو پڑھنے والے کو کبھی زیرلب تبسم اور کبھی بلند آہنگ قہقہہ کی دعوت دیتی ہے۔ مزاح نگاری ایک مشکل فن ہے اور مجتبیٰ حسین ان مشکلات سے بہ خوبی واقف ہیں---------- (تکلف برطرف ۱۹۶۸ء)

کنہیالال کپور

☆ تکلف برطرف! خوب لکھتے ہیں آپ۔ واہ! واہ! دوسروں کی 'انتہا' آپ کی ابتداء

نخستیں گام برمنزل رسیدی

آپ کے مضامین بہت پسند آئے۔ بھئی مشق ستم جاری رکھو' ۳۲ سال کی عمر میں فتنہ ہو' آگے چل کر قیامت ثابت ہوگے۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ کے ترکش میں کئی طرح کے تیر ہیں اور ہر تیر نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ آپ غضب کے تیرانداز ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ ہمیں ہنساتے رہیں------------ (مجتبیٰ حسین کے نام ایک خط میں ۱۹۶۹ء)

غلام احمد فرقت کاکوروی

☆ بڑی خیریت ہوئی کہ چند مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے پہلے پیدا ہوئے' ورنہ یقین مانئے

کہ اگر خدانخواستہ ان کے سن پیدائش کے لگ بھگ پیدا ہو گئے ہوتے تو ہم سبھوں کو کون گھاس ڈالتا۔--------------------(تبصرہ ماہنامہ آج کل سے)

آل احمد سرور

☆مجتبیٰ حسین اس دور کے ممتاز مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ وہ طنز نگار نہیں، مزاح نگار ہیں۔ طنز نگار کا بہ قول رشید احمد صدیقی، عام طور پر کوئی ''کوبڑ'' ہوتا ہے مگر مزاح نگار کسی ایک کوبڑ کے بجائے کئی سے کام لیتا ہے۔ وہ طنز نگار کی طرح ایک ''مجاہد'' نہیں ہوتا جو کسی میلان، روش یا شخصیت کے خلاف جہاد کرتا ہے بلکہ وہ زندگی کی ناہمواریوں، اس کے عجائبات اور شخصیتوں کے تضاد کا مذاق اڑا کر زندگی کے لطف و انبساط میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں تو مزاح نگار بھی کبھی کبھار طنز سے کام لیتا ہے مگر طنز اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ طنز نگار کے یہاں بھی مزاح ہوتا ہے مگر اس کی برہمی اور بیزاری کا کوئی مخصوص ہدف ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط میں مزاح نگاری کی ساری عظمت نظر آتی ہے۔ اکبر کے ہاں طنز نگار اپنے سارے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے مجتبیٰ حسین کی تین خوبیاں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ دوسرے ان کے یہاں تکرار کا عمل نہیں ہے اور تیسرے ان کی تحریروں میں تروتازگی برقرار ہے۔ ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار اور طنز نگار کا مجتبیٰ حسین کو یہ خراج تحسین قابل ذکر ہے۔

مجتبیٰ حسین دراصل **WIT** کے مرد میداں یعنی بذلہ سنجی اور ذکاوت کا پیکر ہیں۔ **WIT** صرف لفظی ظرافت نہیں، لفظ سے ظرافت تو اس میں پیدا کی جاتی ہے مگر ذہن کی کارفرمائی بھی ضروری ہے۔۔ جدید تنقید میں **WIT** کو اس کی ہمہ گیری کی وجہ سے پہلے سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ میرے نزدیک **WIT** مزاح کا ایک موثر آلہ ہے اور اس کی مثالیں مجتبیٰ حسین کے ہاں جابجا ملتی ہے۔----------------(مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں جلد اول)

وحید اختر

☆اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کے مزاحیہ ادب کی بھرپور نمائندگی کون سا شہر کرتا ہے تو بلا جھجک حیدرآباد کا نام لوں گا اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ حیدرآباد کی نمائندگی کون کرتا ہے تو میں بے دریغ ایک ہی نام لے سکتا ہوں اور وہ ہے مجتبیٰ حسین۔ جو خصوصیت انہیں

دوسروں سے ممتاز کرتی ہے' وہ ان کی حیدرآبادیت ہے---------(شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

شمس الرحمان فاروقی

☆بہت دن پہلے جب میں نے مجتبیٰ حسین کی تحریریں پڑھی تھیں تو ان کی نثر کی چستی اور بھونڈے اچھل کود والے لطیفوں اور فقروں سے ان کے اجتناب کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اعلا مزاحیہ تحریروں کا گھر جو ایک عرصہ سے بند پڑا تھا' آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ میں نے اس وقت بھی ان کا خیر مقدم کیا تھا جب وہ حیدرآباد کے ایک بالکل نو آمدہ لیکن چلبلے اور کسی طائر نو پر کی طرح نئی نئی اُڑانیں بھرنے کے شائق مزاح نگار کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے تھے۔ پچھلے بیس برسوں میں میں نے بہت سے نئے ادیبوں سے توقعات وابستہ کیں اور ان میں سے اکثر نے بعد میں مایوس کیا۔ یہ بھی ہمارے زمانے کا المیہ ہے کہ لوگوں کے شعلے بہت جلد بجھ جاتے ہیں یا شاید اب کے لوگ کاروبار ادب میں روحانی اور داخلی منفعت کے بجائے شہرت اور مالی منفعت زیادہ تلاش کرتے ہیں۔ بات جو بھی ہو' میری کتابوں کی الماریاں ایسے مجموعوں سے بھری پڑی ہیں' جن میں شامل تحریروں کے لکھنے والے آج یا تو خاموش ہیں یا پہلے سے بہت خراب لکھ رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں مجھے یہ خوف کئی سال تک رہا کہ یہ چمک دمک یہ آن بان کہیں چار دن کی چاندنی نہ ہو۔ میں نے ان کی ہر تحریر کو اور بعد میں جب ان سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتیں ہونے لگیں تو خود ان کو اسی غور و شوق اور تشویش سے دیکھا جس غور اور شوق اور تشویش سے کوئی ماہر نباتات کسی ایسے پودے کو دیکھتا ہو جس کا دنیا میں صرف ایک نمونہ ہو اور جس پر اس پودے کی تمام نسل کے قیام واستقلال کا دارومدار ہو۔ وہ جس طرح ہر پتی' ڈالی کی ہر نوک اور پھنگی کو توجہ سے دیکھتا ہے کہ کہیں مرجھا تو نہیں رہی ہے' کمزور تو نہیں پڑ رہی ہے' اسی طرح مجتبیٰ حسین ان کی تحریروں کو دیکھتا تھا کیوں کہ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایسا طرح دار مزاح نگار دس پانچ برس کے بعد بھی ترقی کرتا رہے گا۔ کیا معلوم ہمارے بزرگ مزاح وطنز نگاروں کا بھونڈا پن' ان کا مسخرا پن' ان کی تلملاتی ہوئی جھنجھلاہٹ اس پر کب اثر انداز ہو جائے۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے مجھے ہی کیا مجھ سے بہتر لوگوں کو بھی حیرت میں مبتلا رکھا۔

معاصر ظریفانہ ادیبوں میں دو ہی چار ایسے ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کی ادبی حیثیت کو دوبارہ مستحکم کیا ہے۔ ایسے لوگوں میں مجتبیٰ حسین کا نام بہت نمایاں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ظاہر

ہے اس گروہ کے سردار ہیں۔ کوئی اور اصطلاح میسر نہ ہونے پر میں ان لوگوں کو ادبی مزاح وطنز نگار کہتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ مشتاق احمد یوسفی کی طرح مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی اردو کے ادب عالیہ کی روایت کے کارناموں سے گہری واقفیت کا اظہار ہوا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے طنز و مزاح کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سوداؔ اور میرؔ سے لے کر پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔------------------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

مشفق خواجہ

☆ مجتبیٰ حسین خاصے ''جہاں دیدہ'' ہیں۔ انہوں نے محاورتاً دنیا کو خوب اچھی طرح برتا ہے اور عملاً دنیا کے کئی ملکوں کو دیکھا ہے۔ اس لیے ان کے تجربات و مشاہدات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ انہوں نے طنز کی گہرائی اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس سے اور اسلوب کی چاشنی اپنے بڑے بھائی کے جگری دوست ابن انشاء سے لی ہے۔ مزاح میں وہ کسی کے مقلد نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی طباعی اپنی مثال آپ ہے۔ عام لکھنے والے ومردوں سے متعلق طبع زاد واقعات بیان کرتے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین زندوں کے بارے میں بھی طبع زاد باتیں لکھتے ہیں اور اس کی داد زیادہ تر انہیں سے ملتی ہے جن کے بارے میں باتیں لکھی جاتی ہیں۔

وہ بنیادی طور پر افسانہ گو ہیں۔ ان کے بیشتر بلکہ تمام مضامین افسانوی نوعیت کے ہیں جن میں وہ اپنے واقعات دلچسپ ترین اسلوب میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور درمیان میں اس قسم کے معنیٰ خیز اور فکر انگیز جملے کثرت سے آتے رہتے ہیں۔ اب ادیب کا قلم کان پر نہیں رکھا جاتا' اسے ادیب یا تو اپنی جیب میں رکھتا ہے یا قلم سمیت ادیب کو حکومت اپنی جیب میں رکھ لیتی ہے۔ پہلی صورت میں قلم محفوظ رہتا ہے اور دوسری صورت میں ادیب۔

مضامین ہوں یا خاکے یا سفرنامے' ان کا بنیادی وصف مجتبیٰ حسین کا اندازِ بیان ہے۔ وہ ایک ایسی بے تکلفانہ فضا تخلیق کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے اور اس کیفیت سے اسی وقت آزادی حاصل کرتا ہے جب مضمون ختم ہو جاتا ہے--- (خامہ بگوش کے قلم سے فروری ۱۹۹۵ء)

میرزا ادیب لاہور۔ پاکستان

☆ اردو ادب نے ہمیں دو مجتبیٰ حسین دیئے۔ ایک پاکستانی اور دوسرا ہندوستانی۔ ان دونوں نے اُردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ پاکستانی مجتبیٰ حسین سنجیدہ نگار تھے اور ہندوستانی مجتبیٰ

حسین مزاح نگار مگر یہ ایسے مزاح نگار ہیں جو اپنی تخلیقات میں بھرپور سنجیدگی کے قائل نظر آتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ایک مزاح نگار میں جتنی سنجیدگی ہوتی ہے اسی نسبت سے اس کا مرتبہ متعین ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر نے کہا تھا:

اُف وادیٔ جنوں کے وہ پر پیچ راستے
دیوانگی کو بھی کوئی فرزانہ چاہیے

جس طرح دیوانگی کے لیے فرزانگی کی ضرورت ہے، اسی طرح مزاح نگار کے لیے حقیقی سنجیدگی درکار ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مزاح میں سنجیدگی ہے اور سنجیدگی میں مزاح۔ زندگی کے مسائل کی تفہیم میں وہ بڑے سنجیدہ ہیں مگر ان کا انداز پیش کش طنزیہ ومزاحیہ ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مجتبیٰ حسین محبتوں کے سوداگر ہیں۔ میں انہیں سوداگر ماننے کو تیار نہیں۔ سوداگر تو سود و زیاں کا بندہ ہوتا ہے اور مجتبیٰ حسین کو سود و زیاں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ اصل میں قہقہوں اور مسکراہٹوں کے درویش ہیں اور درویش ہوتا ہی وہ شخص ہے جو اپنی پوری متاع، فراخ دلانہ دوسروں کے حوالے کر دیتا اور لٹا دیتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ہمیں قہقہے دیئے ہیں، مسکراہٹیں دی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی خوب صورتی اور بدصورتی سے بھی روشناس کرایا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین ہندوستان میں حیدرآباد دکن کے باسی ہیں اور پاکستان میں لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔ (قطع کلام مرتبہ رعنا فاروقی ۱۹۸۹ء)

انتظار حسین

☆ مجتبیٰ حسین بھی تو اسی حیدرآباد سے مچھ کر نکلے ہیں اور کیا خوب نکلے ہیں۔ حیدرآباد کے اہل دل رو دھو بیٹھے تھے۔ سوچتے تھے کہ اپنے زوال کے ساتھ وہ شہر ٹھنڈا ہو گیا مگر دیکھئے کہ اسی خاکستر سے یہ چنگاری برآمد ہوئی ہے بلکہ اس شہر میں ظرافت کی فصل پھولتے دیکھ کر اسے زعفران زار حیدرآباد کہنے کو جی چاہتا ہے اور زعفران زار حیدرآباد سے کیا شگوفہ پھوٹا ہے کہ رنگین مزاح میں اس وقت اپنا ثانی نہیں رکھتا ---------- (جشن مجتبیٰ حسین۔ دوبئ)

نثار احمد فاروقی

☆ پچھلی نسلوں نے ہمارے لیے طنز و مزاح کا جو ورثہ چھوڑا تھا، مجتبیٰ حسین نے اس کو اور اس کی خصوصیات کو نہ صرف محفوظ رکھا ہے بلکہ اس کو زمین کو گہرائی تک اور عام آدمی کے زندہ

مسئلوں سے دور تک جوڑ کر زیادہ وسیع اور بامعنیٰ بنا دیا ہے------(شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

مخمور سعیدی

☆مجتبیٰ کی خاکہ نگاری کو ان کی مزاح نگاری کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے اور ان کے خاکوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں صاحب خاکہ کے وہ خد و خال ابھر کر سامنے آئیں گے جو لوگوں کو ہنسنے ہنسانے کا موقع فراہم کر سکیں۔ بلاشبہ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ قاری یا سامع کو ہنسنے ہنسانے کا موقع فراہم کرتے ہیں لیکن اپنے ہدف کے لیے ان کا غیر ہمدردانہ اور بیشتر صورتوں میں دوستانہ رہتا ہے۔ وہ اس کے کردار کے ناہموار پہلوؤں کو ابھارتے تو ہیں مگر انہیں تضحیک و تمسخر کا نشانہ نہیں بناتے' خندہ' استہزا پیدا کرنے کے لیے وہ عموماً ان حالات و واقعات کا سہارا لیتے ہیں جو ہماری شخصی کمزوریوں سے زیادہ ہماری سماجی ناہمواریوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ شخصی کمزوریوں سے وہ صرف نظر تو کرتے ہیں لیکن ان کا بیان اس انداز سے کرتے ہیں جیسے انہیں درگزر کر دینے کی سفارش کر رہے ہیں۔ یہ ان کی وہی طبعی شرافت ہے جس نے ان کی زندہ دلی میں بھی ایک دردمندی کی کیفیت شامل کر دی ہے۔

(آج کل' نئی دہلی)

آغا روحی

☆میں مجتبیٰ حسین سے ان کی مزاح نگاری کی وجہ سے متاثر نہ ہو پاتا مگر مجھے مجتبیٰ کی ہنسی بہت ہی معیاری نظر آئی۔ اس کی روح کے ہر رخ پر کوئی پرانا زخم ہے اور جب وہ مندمل ہونے لگتا ہے اور پھر وہیں چوٹ پڑتی ہے تو مجتبیٰ دل کھول کر ہنستا ہے--- جب وہ ہنستا ہے تو اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس ہنسی میں شریک کر لیتا ہے اور یہی اس کی زخمی روح کی عظمت ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہوتی ہیں اور وہ ہنستا ہے' اس کا کرب اس کے اندر دل پر ٹھوکریں لگاتا ہے اور وہ ہنستا ہے۔ اس کی حساس طبیعت اسے ٹارچر کرتی ہے اور وہ ہنستا ہے۔ شاید اس نے ہنسنے کو پہلے ہنر سمجھا ہو گا مگر اب تو اسے فریضہ بلکہ عبادت بنا چکا ہے۔ عبادت اس لیے کہ جب اسے ہنسنے کو کوئی نہ ملے تو وہ اپنے آپ پر ہنستا ہے جو کہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔

(شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

شمیم قیصر نصرتی

☆ مجتبیٰ حسین کے مضامین میں زندگی کے وہی مسائل و واقعات ملیں گے جو انسان کا مقدر بن چکے ہیں جن کی گتھیوں کی وہ سالہا سال سے سلجھانے کی مسلسل جدوجہد کر رہا ہے لیکن گتھیاں سلجھنے کی بجائے اور الجھتی جا رہی ہیں۔ مجتبیٰ ان گتھیوں کو اپنے طنز و مزاح کا ذریعہ بنانے میں اور ایک پراگندہ ذہن قاری کو جو کشمکش حیات سے تنگ آ چکا ہو ایک نئی زندگی عطا کر کے اس کے غموں اور افکار میں برابر کے حصہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ سماج کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اپنے ماحول کی گہرائیوں میں ڈوب کر زندگی کے مسائل کو اپنی فکر و ذہن اور رسائی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور نتائج کو انتہائی سادگی اور معصومیت سے دل کش انداز میں قارئین کے آگے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ قاری کے دل و دماغ پر ایک گہرا تاثر چھوڑتا ہے اور قاری کے ذہن میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی کیف و مستی کے عالم میں خود کو مسرور پاتا ہے یا پھر ملول ہو جاتا ہے۔ قاری میں جذبۂ مسرت کا پیدا ہونا مجتبیٰ حسین کے کمالِ فن اور اعلا مزاح کا جادو ہے، قاری کا سنجیدہ خاطر ہونا ان کے تیکھے پن کا اثر ہے۔ مجتبیٰ جہاں قاری کو ہنسا سکتے ہیں، وہیں رُلانا بھی خوب جانتے ہیں۔

(شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

مظہر امام

☆ مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں لیکن وہ طنز سے بھی بے حد خوب صورت کام لیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین طنز بھی کر رہے ہوں تو وہ تعصب یا بغض و عناد سے عاری ہوتا ہے۔ ان کے فن کا نمایاں عنصر انسانی ہمدردی ہے۔ مزاحیہ ادب کو مزاحیہ ہونے سے پہلے ادب ہونا چاہئے۔ ہمارے اکثر مزاح نگار اس فرق کو فراموش کر جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں اپنے اسلوب، طریقۂ اظہار اور زبان و بیان کی جمال آفرینی کے باعث ادب کے بلند درجہ پر فائز ہیں۔

(سوئیر مجتبیٰ حسین، دوبئ)

پروفیسر سوزوکی تاکیشی

☆ مجتبیٰ صاحب ٹوکیو میں قیام کے دوران جس ہوٹل میں رہے، اس کا کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ پنجرے کا گمان ہوتا ہے۔ اتفاق سے اسی ہوٹل میں میرے ایک پاکستانی دوست کو ٹھہرنا پڑا

تھا۔ آج سے کوئی دس سال پرانی بات ہے۔ وہ بدنصیب اس تنگ کمرے سے اتنا گھبرا گیا کہ بہت جلد اپنے آپ کو قیدی سمجھنے لگا۔ یوروپی مشترکہ منڈی کے ایک معتمد صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ جاپانیوں کے گھر خرگوش خانے کے برابر ہیں' کیا عجب کہ ٹوکیو کے ایک معمولی ہوٹل کے کمرے کو میرے دوست نے قید خانہ قرار دیا ہو۔ مگر اسی کمرے کی کیفیت کو مجتبیٰ صاحب اس طرح دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے۔ یہ عام فہم حقیقت ہے کہ مزاح اور طنز میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ طنز نگار اپنی جگہ اور مزاح نگاری دوسری جگہ۔ طنز کی علامت نفرت کی اساس پر تعمیر کی جاتی ہے۔ ادھر مزاح نگاری میں محبت اور ہمدردی ناگزیر ہوتی ہے اور اسی لیے ایک مزاح نگاری کا دل بھی محبت اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہونا بھی ضروری ہے---------------------(ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

فکر تونسوی

☆ مجتبیٰ حسین کم بخت کے لہجے میں بھی جادو ہے اور کردار میں بھی۔ (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

یوسف ناظم

☆ دلی کے مصروف ترین لوگوں کی فہرست میں مجتبیٰ کا نام شروع کے ناموں میں آتا ہے۔ کسی نہ کسی کے کام سے دلی کی سڑکوں کی پیمائش ان کے لیے ضروری ہے۔ دلی کے جغرافیے سے اگر کوئی شخص پوری طرح واقف ہے تو وہ مجتبیٰ ہیں۔ مشہور تو یہ ہے کہ خود دلی کے باشندے اب مجتبیٰ سے پوچھنے لگے ہیں کہ یہ گھنٹا مسجد روڈ کہاں واقع ہے اور چتلی قبر جانے کا راستہ کون سا ہے اور مجتبیٰ چتلی قبر کا راستہ بتانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ دلی میں ایک حیدرآباد ہاؤس ہوا کرتا تھا جو حیدرآباد دکن کے اندرونی سفیر دہلی کی قیام گاہ تھا۔ اب ریاستوں کے اندرونی سفراء کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے۔ سرکاری سطح پر تو حیدرآباد ہاؤس وہاں نہیں رہا لیکن ادبی سطح پر ایک چھوٹا موٹا ہاؤس این سی ای آر ٹی کیمپس میں قائم ہوگیا۔ ہاؤس فل کی تختیاں آویزاں رہتی ہیں۔ وٹھل راؤ کی موسیقی بھی یہاں ہوتی ہے اور زندہ دلان حیدرآباد کی ہنگامی میٹنگ بھی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خود مجتبیٰ گھر پر موجود ہوں اور ایسے مواقع شاذ و

نادر ہی آتے ہیں-----------------(ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

خشونت سنگھ

☆ مجتبیٰ حسین کے سفر ناموں کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے آپ پر ہنسنے کا زبردست حوصلہ رکھتے ہیں۔

اختر حسن

☆ حیدرآباد کے اس ادیب طناز وظرافت پرداز کی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ برملا اور کچھ خفیہ اشاروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین جو کچھ لکھتے ہیں' ایک ہی نشست میں لکھتے ہیں یعنی جب پورا مضمون لکھ چکتے ہیں تبھی برخواست ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین طنز ومزاح کی ایک چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا ہیں۔

مجتبیٰ حسین طنز ومزاح لکھتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں یعنی خلوت میں لکھتے ہیں اور جلوت میں بولتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کو صحت سے زیادہ صحبت عزیز ہے۔ اسی وجہ سے اب تک انہوں نے سورج کو نکلتے اور چاند کو ڈوبتے نہیں دیکھا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں واماندگی نہیں ہوتی ہے' وارفتگی ہوتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی زبان پہلے صاف ستھری ہوتی تھی' اب دھلی ہوئی ہوتی ہے اور اس پر وہ استری بھی پھیر دیتے ہیں۔

وہ زبان کے تمام حربوں سے کام لینا سیکھ گئے ہیں۔ اندیشہ اس بات کا پیدا ہو گیا ہے کہ اگر وہ بہ کثرت اس طرف راغب ہو جائیں تو بھینس کے انڈے سے روغن گل نکالنے کی طرف نہ چلے جائیں۔

لیکن مجتبیٰ حسین کی سلامت روی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس وادیٔ پُر پیچ سے بھی وہ صحیح سلامت گزر جائیں گے۔

مجتبیٰ حسین کو اُردو کے محاوروں اور روز مروں پر بھی خاصی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ جن کے برمحل استعمال سے وہ اپنے مزاح میں چار چاند اور اپنے طنز میں آٹھ ستارے ٹانک دیتے

ہیں۔

مجتبیٰ حسین تشبیہ' استعارہ' اشارہ' کنایہ' تلمیح' تمثیل اور تمام صنائع لفظی و معنوی کو برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور اسی سلیقے کی بدولت مزاح نگاری میں ان کی نبھ رہی ہے۔

مجتبیٰ حسین کا اسلوب نگارش سادہ پُرکار کا ہوتا ہے۔ بالکل خوبان غالب کے مانند۔

داستانی طرز کی نثر لکھنے میں بھی انہیں کمال حاصل ہے۔

عبارت مختصر دکن کے اس سانولے سلونے' خوش مزاج و خوش گفتار و خوش افکار ادیب کی نگارشات' اردو کے عصری ادب کا ایک قیمتی تحفہ ہیں------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

پروفیسر مغنی تبسم

☆ مجتبیٰ حسین ہندوستان کے ان چند ایک مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کی شہرت اور مقبولیت ارضی اور لسانی سرحدوں کو عبور کر گئی ہے۔ برصغیر کے علاوہ دنیا کے اور ملکوں میں جہاں کہیں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے' لوگ مجتبیٰ حسین کے نام ہی سے نہیں کام سے بھی واقف ہیں اور ان کی تحریروں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور سنتے ہیں۔ خود مجتبیٰ حسین دنیا کے کئی ملکوں کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ جہاں بھی گئے' ان کے اعزاز میں محفلیں منعقد ہوئیں۔ ان کے مضامین سنے گئے۔ اس کے علاوہ ان کے سفرناموں' انشائیوں اور خاکوں کے ترجمے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اُردو میں مزاح نگاری کے دو پیرایوں کی واضح نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ ایک پیرایہ وہ ہے جس میں واقعات کے سہارے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ حسنِ بیان پر زیادہ اور لطف زبان پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس رجحان کی نمائندگی پطرس بخاری کرتے ہیں۔ دوسرا پیرایہ وہ ہے جس میں واقعات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزاح نگار زیادہ تر الفاظ سے کھیلتا ہے اور زبان کے مخصوص استعمال سے مزاح پیدا کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا مزاح کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ان دونوں اسالیب کے امتزاج سے اپنا منفرد طرز ایجاد کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی ان دونوں پیرایوں سے کام لیتے ہیں لیکن ان کا طریقہ کار اور اسلوب مختلف ہے۔

مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ ان کا موضوع انسان ہے اور وہ انسان کو سماج کے چوکھٹے میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ انہیں واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ ان کا مشاہدہ جزئیات بین ہے اور اسی وصف کو کام میں لاکر وہ کسی واقعے کے مضحک

پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات بھی ان کی توجہ سے نہیں چوکتے۔ سماج کے مختلف طبقوں اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرزِ زندگی، ان کے مسائل اور ان کے مخصوص رویوں، عادتوں اور خصائل کا انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ کسی واقعہ کو محسوس بنا کر پیش کرنا اور کسی کردار کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا مجتبیٰ حسین کے فن کا خاص وصف ہے------------ (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

ڈاکٹر قمر رئیس

☆ مجتبیٰ حسین کی ایک خاص ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ مزاحیہ میں افسانوی اور ڈرامائی دونوں عناصر سے کام لیتے ہیں۔ واقعات لطیفوں اور پیکروں کا وہ ایک ایسا سلسلہ خلق کرتے ہیں جو قاری کی دلچسپی ایک پل کے لیے کم نہیں ہونے دیتا۔ صرف یہی نہیں وہ واقعاتی تسلسل میں تصادم اور کشمکش کے عناصر بھی پیدا کرتے ہیں۔ کلائمکس بھی تعمیر کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن واقعات سے وہ مضمون کا تانا بانا بُنتے ہیں، وہ واقعات اپنے آپ میں بھرپور ڈرامائی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ بیانیہ کی قوت ایسی محاکاتی ہوتی ہے کہ لگتا ہے ہم ڈرامہ کا ایک منظر دیکھ رہے ہیں------------ (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

عمیق حنفی

☆ آج کل سیاسی طنز کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کا چلن ہے اور کیوں نہ ہو کہ سیاست یا تو رُلاتی ہے یا ہنساتی ہے۔ مجتبیٰ حسین سیاست کی بیساکھی کے بغیر کامیابی اور کامرانی کے ساتھ ہنساتے ہیں اور ہنسی کے دھاروں سے بجلی کی ایک رو پیدا ہوتی ہے جو ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی دماغ میں پہنچتی ہے جہاں کئی قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے مزاح کا سفر تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، بالآخر اور آدمی نامہ سے جاپان چلو، جاپان چلو، تک پھیلا ہوا ہے۔ کوئی شئے ہو، کوئی واقعہ ہو، کوئی خبر ہو، کوئی شخص ہو یا کوئی ملک ہو، انہیں ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کر ہی دیتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور کڑوے سے کڑوے نکتوں میں انہیں ایسے شوشے نظر آجاتے ہیں جن میں خوش مزاجی اور زندہ دلی بھری ہوئی مل جاتی ہے اور وہ چٹکی بجاتے ہیں تو گدگدیاں اُڑنے لگتی ہیں۔ تلخ سے تلخ حقیقت بھی مزاح کی شکر کے خول میں

لپٹ کر اندر اُتر جاتی ہے اور کام و دہن بھی تلخ نہیں ہوتے۔ برف کی الماری ہو،ہاسیہ رتن کا خطاب پانے کی تقریب ہو، عمیق حنفی ہو یا ملک جاپان ہو، مجتبیٰ حسین کو جعفر زٹلی، مُلّا دو پیازہ اور دادا لال بجھکڑ بنائے بغیر نہیں چھوڑتے ---------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

پروفیسر شمیم حنفی

☆مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مزاح اور سنجیدگی کے روایتی فرق سے لاتعلقی کا بہت خاموش اظہار، سب سے زیادہ ان کے شخصی خاکوں میں ہوا ہے۔ وہ مزاح اور سنجیدگی کے فرق سے نہ تو باضابطہ انکار کرتے ہیں نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافی سے کام لیتے ہیں مگر ان کا کوئی بھی خاکہ اٹھایئے، اسے پڑھتے پڑھتے، آپ کہاں، کس نقطے پر مزاح سے نکل کر سنجیدگی کے حدود میں داخل ہو گئے، اس کا احساس آپ کو اس وقت ہوتا ہے جب اچانک آپ کا اپنے ردعمل میں تبدیلی کی طرف دھیان چلا جائے۔ ایسا نہیں کہ مجتبیٰ حسین رسمی نوعیت کے مزاح نگاروں سے یکسر مختلف ہیں۔ فقرے بازی، لطیفہ سازی، زبان کے پینتروں، بہ ظاہر سیدھی سادی انسانی صورت حال میں مضحک، بے ڈول اور عجیب الوضع زاویوں کی تلاش سے مجتبیٰ حسین نے بھی بہت کام لیا ہے۔ یہ سب کے سب مزاح نگاروں کے آزمودہ بلکہ فرسودہ نسخے ہیں اور ان پر ضرورت سے زیادہ انحصار کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ بعض مزاح نگاروں کے یہاں مزاح کا عنصر، بس سنے سنائے لطیفوں یا زبان و بیان کے فرسودہ ہتھکنڈوں کے استعمال تک ہے۔ اُردو میں مزاح کی مجموعی صورت حال ایسی نہیں کہ جو کسی بھی لحاظ سے قابل قدر اور تشفی بخش کہی جا سکے۔ خاص طور سے ہندوستان میں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے بیشتر مزاح نگاروں کی ہر کوشش یا تو بہت مصنوعی **Contrived** اور از کار رفتہ ہوتی ہے یا پھر اتنی عام اور مانوس کہ اس پر کسی نئے شگفتہ لمحے کے انکشاف کا کوئی گمان نہیں ہوتا۔ اُردو کے زیادہ تر مزاح نگار صرف محدود معنوں میں مزاح نگار بنے رہنے پر قانع دکھائی دیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کو پڑھتے یا سنتے وقت مجھے اپنے احساسات میں ایک حرارت آمیز اہتزاز کا اور دھڑکنوں کی رفتار میں تیزی کا تجربہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مجتبیٰ حسین بے تکلف اور بے ساختہ انداز میں کسی شخصیت کا خاکہ باندھتے باندھتے اچانک سنجیدہ ہو جاتے

ہیں اور تجزیے کی ان حدوں میں جا پہنچتے ہیں جو ہمارے مزاح نگاروں کی اکثریت کے لیے ممنوعہ علاقے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں قہقہوں اور آنسوؤں کی تمیز بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تبسم کے پردے میں ایک گہرے افسوس کو چھپانے کی وہ مستقل کوشش کر رہے ہیں اور اپنے قاری کو ماورائے بیان جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔
(ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

☆ مجتبیٰ حسین کی ایک خاص بات جو مجھے بے حد بھلی لگی، وہ یہ ہے کہ میں نے ان کے منہ سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ انہوں نے کبھی دشمن کو بھی برا نہیں کہا ہر ایک کا بھلا مانگتے ہیں۔ اہل قلم حضرات میں یہ صفت بہت کم پائی جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ان کو غالب ایوارڈ برائے مزاح ملا تو یہ میرے پاس رونی صورت لے کر آئے اور کہنے لگے۔ ''غالب انسٹی ٹیوٹ نے اچھا نہیں کیا۔ اس ایوارڈ کے حق دار فکر تونسوی تھے۔ دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنا ان کی فطرت سی بن گئی ہے۔ خدا کرے ان کی یہ فطرت دوسرے ادیب اور شاعر بھی اپنائیں۔
(ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

بھارت چند کھنہ

☆ مجتبیٰ حسین صاحب قلم تراش قسم کے تیز انسان ہیں۔ زندگی میں مزاح کی قاشیں تراشنے میں خود کو ہمہ تن مصروف رکھتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین گنتی کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جن کی کتابوں کی مانگ ہے ------------------ (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

وجاہت علی سندیلوی

☆ میں نے مجتبیٰ حسین کا جب پہلا مضمون پڑھا تو مجھے بہت پسند آیا اور میں نے سوچا کہ مزاحیہ ادب کے افق پر ایک نیا روشن ستارہ نمودار ہوا ہے لیکن جب مجھے پتا چلا کہ یہ ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی کا لکھا ہوا ہے تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا اور مجھے اس سے ایک نیا لطف و انبساط حاصل ہوا۔ مجتبیٰ حسین کوئی حادثہ نہیں بلکہ حالات کا ایک تسلسل ہے۔ اس کے پس پشت تابندہ ادبی روایات اور نظریاتی اقدار بھی ہیں۔ وہ ایک گل سرسبد ہے جس نے جداگانہ رنگ و بو رکھتے ہوئے بھی اپنے چمن سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے۔ یہ ایک صحت مند علامت اور

مجتبیٰ حسین کی راست بینی کی دلیل ہے۔ مجتبیٰ حسین کو میں پسند کرتا ہوں' اسے چاہتا ہوں اس کی عزت کرتا ہوں' اگر وہ محبوب حسین جگر کا چھوٹا بھائی ہے تو میرا بھی محبوب ہے۔ مجھے اس سے اگر کوئی شکایت ہے تو بس یہی کہ اپنی پوری زندگی میں اس سے میں چند ہی بار مل پایا ہوں یعنی صرف آٹھ دس مرتبہ لکھنؤ' بھوپال' دہلی' پٹنہ میں مزاحیہ کانفرنسوں اور سیمناروں کے سلسلے میں اور ہر مرتبہ مجھے یہی شکوہ رہا۔

سیر گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

مجتبیٰ حسین میں حیدر آبادی تہذیب' شائستگی اور علم مجلس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کی گفتگو کی شگفتگی اور دلآویزی ان کی تحریر سے کسی صورت کم نہیں۔ مجتبیٰ حسین کے خطوط بھی بڑے پرخلوص اور دلچسپ ہوتے ہیں۔------------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

ڈاکٹر مظفر حنفی

☆ مجتبیٰ حسین عام زندگی میں جتنے سادہ لوح ہیں' خاکہ نگاری میں اتنے ہی چالاک۔ مدح بالذم اور تنقیص نما توصیف کے ایسے ایسے گر انہیں یاد ہیں کہ وہ آپ کے منہ پر بات کہہ جائیں اور کئی دن بعد آپ پر یہ عقدہ کھلے کہ حضرت نے آپ کی کسی خوبی کو نہیں خامی کو اُجاگر کیا تھا۔ دراصل فی البدیہہ مزاحیہ مضامین لکھ لکھ کر وہ اتنے چابکدست ہو گئے ہیں کہ جب ان کا چابک ممدوح پر پڑتا ہے تو وہ اسے سمند شوق پر تازیانہ تصور کرتا ہے۔ اس باب میں وہ کسی کے ساتھ مروت روا نہیں رکھتے۔ لطف یہ ہے کہ بہ حیثیت مزاح نگار کسی شخصیت کے ناہموار پہلو پہلی ہی نگاہ میں ان پر منکشف ہو جاتے ہیں اور وہ کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان کا قاری بھی پہلی نظر میں ہی متعلقہ شخصیت کی ناہمواری سے واقف ہو جائے۔ یہ مہم وہ بڑی ہی معصومیت کے ساتھ خاکے کے موضوع کی مدد سے سر کرتے ہیں---------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

مسیح انجم

☆ مجتبیٰ حسین کے چہرے پر سوائے دو خوب صورت آنکھوں کے کچھ اور ہے ہی نہیں اور یہ آنکھیں بھی ایسی ہیں جن میں ہر وقت شوخی و شرارت مچلتی رہتی ہے اور وہ ان کے حد درجہ ذہین اور چالاک ہونے کا پتا بھی دیتی ہیں۔ یوں تو کہنے کو گال بھی ہیں مگر پچکے ہوئے' ویسے ٹھوڑی بھی ہے۔ اگر وہ کسی قدر اور ذرا اوپر کی جانب مڑ جاتی تو پورا چہرہ طوطا پری آم کا سا دکھائی دیتا۔

ناک معقول سی پائی ہے، ہونٹ پتلے پتلے' لیکن ناک اور ٹھوڑی سے ٹھیک ٹھیک زاویہ قائمہ بناتے ہوئے نوے ڈگری پر تقسیم نہیں ہوتے۔ نچلا ہونٹ اوپری ہونٹ کو پکڑنے کی علت میں کسی قدر سیدھی جان ٹیڑھا ہوگیا ہے۔ ان کا چہرہ اسکرین فیس کی تعریف میں آتا ہے۔ تصویر خوب صورت چھپتی ہے۔ پتا نہیں فلم انڈسٹری میں کیوں نہیں گئے۔ شاید انہیں اس بات کا اندازہ ہو کہ فلم کی ہیروئن انہیں دیکھتے ہی فلم میں کام کرنا چھوڑ دے گی۔ سیدھا پاؤں کسی قدر پھینک کر چلتے ہیں۔ آخر پھینکنے کے لیے بھی تو کوئی چیز چاہیے نا' ان کی سب سے بڑی کمزوری سگریٹ ہے۔ وہ بے تحاشا سگریٹ پیا کرتے ہیں۔ ان کے خون کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں ہمہ اقسام کی سگریٹوں اور بیڑیوں کے خواص پائے جائیں گے۔ مگر تعصب' تنگ نظری اور نفرت کا زہر نہیں ملے گا۔ مجتبیٰ حسین تو محبت و مروت کا پیکر ہیں--------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

پروانہ رُدولوی

☆ مجتبیٰ حسین ایک منفرد طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کا طنز بھی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے اور مزاح بھی زندگی کی دھوپ چھاؤں سے متعارف کراتا ہے۔ ان کے قلم کی کاٹ' ان کی گہری بصیرت اور سماج کو بدلنے کے لیے ان کی بے تابی کی مظہر ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے' وہ محض سننے سنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ سوچنے' غور کرنے اور سوچ وچار کے بعد اصلاحی اقدامات کرنے کے لیے ہے اور ان کی تحریر کی یہی خوبی ان کو معاصرین سے الگ کرتی ہے۔ ان کے مزاح میں طنز کے گہرے نشتر ہیں اور نشتروں کے آر پار دیکھا جائے تو اصلاحِ معاشرہ کی گہری خواہش اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔ (ماہنامہ اردو دنیا)

زبیر رضوی

☆ ابتدائی دنوں میں تو دلی کی ادبی بساط پر مجتبیٰ حسین کو اپنے پیر نکالنے کی بھی جگہ نہیں ملی۔ اس بیچ بندھیا چل کے اس پار سے ان کے نام بچھڑے ہوئے رفیقوں کے بلاوے آتے رہے' ان کی جیبوں کی تلاشی لینے پر ایک جیب سے چار مینار اور دوسری جیب سے قطب مینار کے ماڈل برآمد ہوتے۔ مجتبیٰ حسین اپنی اس بٹی ہوئی شخصیت کے ساتھ حیدرآبادیوں اور دلی والوں میں گھلتے ملتے رہے' ان کی باتوں کا خوش ذائقہ نمک بہت جلد دلی والوں کو چٹخارہ دینے لگا اور وہ دن بھی آیا جب ادبی محفلوں اور مجلسوں میں مجتبیٰ حسین کے داخل ہوتے ہی بے شمار

ہاتھ گرم جوشی کے ساتھ ان کی طرف بڑھنے لگے۔ اردو کی وہ محفلیں جو سپاٹ اور بے روح تقریروں اور بے جان حاشیہ آرائیوں کی بنیاد پر اردو کے کج کلاہوں اور طرح داروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر پاتی تھیں، وہ مجتبیٰ حسین کی موجودگی اور خاکہ نگاریوں کی دھوم سے جاگ سی اٹھیں، ادھر دس برسوں میں دلی میں نئی کتابوں کی رونمائی، انفرادی ادیبوں کے جشن اور سیمیناروں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے، جس طرح روایتی برق والے نوشاہی لباس کے بغیر کسی دولہا کی بارات عروسی فضا نہیں بناتی، اسی طرح کسی کتاب کی رونمائی، کسی شاعر کا جشن، مجتبیٰ حسین کے خاکے کے بغیر مزہ نہیں دیتا۔ محفل کے خاتمہ پر لوگ کتاب کا نام اور صاحب جشن کا نام تو بھول جاتے ہیں مگر مجتبیٰ حسین کا خاکہ اور نام کئی دن تک چائے خانوں کی ادبی صحبتوں میں چٹکیاں لیتا رہتا ہے، ان کے گھر اور دفتر کے ٹیلی فون کی زیادہ تر گھنٹیاں وہ ہوتی ہیں جو صاحب خاکہ کو خاکہ لکھے جانے کی خوش خبری سے تعلق رکھتی ہیں (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

علی باقر

☆ میرا خیال ہے کہ مجتبیٰ حسین کے ہم عصروں نے اس کا ادبی مقام متعین کرنے میں بڑی بخالت سے کام لیا ہے جب کہ مجتبیٰ حسین دل کا غنی ہے۔ سب کی دل کھول کر تعریف کرتا ہے اور خلوص سے، خوشی سے، یہ شاید اس لیے کہ مجتبیٰ حسین کو کسی سے کچھ مانگنا، کسی سے تقاضا کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کسی بھی ادب کی تاریخ میں ان تخلیق کاروں کے نام جلی حروف سے لکھے جاتے ہیں جن کی تخلیق انفرادی ہوتی ہے، کسی ایسی صنف سے تعلق رکھتی ہے، جس کو عام رہ گزر نہیں کہا جا سکتا اور مزاح نگاری یقیناً ایسی صنف ہے اور اس میدان میں مجتبیٰ کا مقام منفرد ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریر میں حرکت ہے، روانی ہے، اس کا کوئی فقرہ ٹھہرا ٹھہرا نہیں لگتا۔ اس کے بیان میں تصنع کا فقدان ہے اور ایک ایسی بے باکی ہے جو اپنے مشاہدے کے خلوص کی بنیاد پر فن کا درجہ پا لیتی ہے۔ خاکہ لکھنا اور خاکے میں سراپا بیان کرنا مجتبیٰ کے محبوب مشغلوں میں سے ایک ہے۔ اس کا قلم ایک ماہر آرٹسٹ کا برش بن جاتا ہے۔ اس کی نظر شخصیت کی ہر ایسی خصوصیت پر جا کر رُکتی ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ سی تھی اور پھر جب وہ اس منفرد تحقیق کو بیان کرتا ہے تو سننے والے داد دینے لگتے ہیں، وہ حقیقت نگاری کرتا ہے مگر زبان کی چاشنی اس تحریر میں شعر کا سا حسن پیدا کر دیتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ لکھتے وقت مجتبیٰ کی

پانچوں حسیں جاگتی رہتی ہیں اور اطراف کی ہر چیز کے مشاہدے میں مصروف رہتی ہیں اور جو کچھ مجتبیٰ کے تجربہ اور احساس کے احاطہ میں آجاتا ہے' اسے قلم کی نوک سے اٹھالیتا ہے' مجتبیٰ جو کچھ اپنے قلم کے ذریعہ آپ کو باور کرانا چاہتا ہے' اس میں اس کو ذرہ برابر تکلیف نہیں ہوتی اور کبھی کہیں اس سے کوئی غلطی ہو بھی جاتی ہے تو اتنے پرخلوص طریقے سے کہ آپ اس کو فوراً معاف کردیتے ہیں چوں کہ انسانی جذبات میں صرف ہمدردی' غمگساری اور خلوص کے رنگوں پر قدرت حاصل کرنے کے لیے نیت میں سنجیدگی اور سچائی ضروری ہوتی ہے اور مجتبیٰ حسین اردو کا ایک قابل فخر مزاح نگار' دراصل بہت سنجیدہ اور بہت سچا آدمی ہے۔ مجتبیٰ کے ہم عصروں میں کوئی اتنا قدآور' اردو تہذیب کے مزاج سے اتنا واقف' اتنا مخلص مزاح نگار مجھے نظر نہیں آیا۔ اس نے مزاح نگاری کو اپناتے ہوئے مسخرہ پن اور پھکڑ پن سے دامن بچایا ہے۔ اس نے اگر طنز بھی کیا ہے تو دوسروں کا دل نہ توڑنے کی قسم کھا کر۔ اگر اتنی احتیاط مجتبیٰ میں نہ ہوتی تو ہم اس کو اُردو کا آسکر وائلڈ کہہ سکتے تھے --------------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

نریندر ناتھ لوتھر

☆ میں نے مجتبیٰ حسین کو کبھی کسی شخص یا ادیب کے خلاف بات کرتے نہیں سنا۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ وہ دوسرے ادیبوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی ذہنیت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور یہ رویہ صرف وہی لوگ اپنا سکتے ہیں' جنہیں دوسروں سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ طنز و مزاح میں مجتبیٰ حسین کا نام اب اس مقام پر ہے کہ اس کو کوئی گرا نہیں سکتا' کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شاید اسی لیے اس میں خوش حالی سے پیدا ہونے والا خیر سگالی کا جذبہ ہے۔ میں سمجھتا ہو کہ مجتبیٰ کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ --------- (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

ڈاکٹر شہریار

☆ مجتبیٰ حسین صرف باتیں نہیں کرتے کام بھی کرتے ہیں یعنی بڑے کام کے آدمی ہیں۔ دہلی بلکہ ہندوستان میں کوئی جائز کام اور ضرورت پڑنے پر ناجائز کام بھی آپ کو کرانا ہو تو مجتبیٰ سے رجوع کیجئے۔ شرط یہ ہے کہ وہ آپ کو اپنا دوست سمجھتے ہوں۔ وہ اور ان کا اسکوٹر اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک کام مکمل نہ ہو جائے۔ ان کے معمولات کا اندازہ ان کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ دن اور رات کہیں بھی گزاروں' صبح کو اپنے بستر سے اٹھوں' ان کی

بیوی یعنی میری بھابھی ان کی اسی ادا پر جان دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ انہوں نے یہ بات شادی کی پہلی رات کو مجھ سے کہی تھی۔ زبان کے بڑے پکے ہیں۔ آج تک اس بات پر قائم ہیں۔ این سی ای آر ٹی کی کتابوں کو چھپوانے اور ٹھکانے لگانے کے علاوہ ان کا کام دوسروں کے لیے روزی ڈھونڈنا' مکان تلاش کرنا' دوستیاں کرانا' ضرورت مندوں کو منسٹروں سے ملوانا' الیکشن کے ٹکٹ دلوانا' اخباروں میں لوگوں کے فوٹو ان کے کارناموں کی خبریں چھپوانا' کتابوں کی رسم اجراء پر ادیبوں کے خاکے ہی نہیں لکھنا بلکہ پیسوں کی فراہمی کا انتظام کرنا' پاسپورٹ اور ویزا بنوانا شوہر اور بیوی کے تعلقات کو درست کرانا اور تعلقات کی خرابی کے قانونی اور کبھی کبھی طبی نکات پر روشنی ڈالنا' میں کہاں تک گنواؤں موصوف کا دائرہ عمل۔ بس یوں سمجھئے لیجئے کہ اردو میں یہ پہلے اور آخری سپر مین ہیں۔ خود ان کا کہنا ہے کہ **Too Much** تک سب جاسکتے ہیں۔ ہم **Three Much** ہیں اور مرتے دم تک اس پر قائم رہیں گے (ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

☆ مجتبیٰ حسین عصری اردو طنز و مزاح کا ایک معتبر نام ہے' مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر کا کوئی تیس سال قبل آغاز ہوا۔ کالم نگاری اس سفر کی پہلی منزل تھی۔ ایک ایسے دور میں جب کہ کالم نگاری کی روایت' خاص طور سے ہندوستان میں' کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی تھی' ذہین وفطین نوجوان مجتبیٰ حسین نے اپنی جولانی طبع' ندرت فکر' برجستگی اور لطیفہ سنجی کے ذریعہ ادبی وصحافتی حلقوں کو چونکا دیا۔ حیات انسانی کے ان گنت مضحک پہلو' خلوت وجلوت کی کارستانیاں' ادب وسماج کی بوالعجبیاں' سیاست دانوں کی ریاکاری اور عام شہری مسائل مجتبیٰ حسین کے مخصوص انداز نگارش کا ہدف بننے لگے۔ یہ ظریفانہ اسلوب کینہ کپٹ' طعن وتشنیع اور زہرناکی سے عاری لطف وانبساط کا خزانہ تھا۔ شیشہ وتیشہ' کے لیے لکھے گئے ان کالموں میں آمد ہی آمد تھی۔ اسلوب کی یہ شیرینی' تلخی دوراں کا شکار اردو کے قاری کو نیا مزہ دے گئی اور تابڑتوڑ یکے بعد دیگرے مجتبیٰ حسین کے دلچسپ اور پرلطف مزاحیہ مضامین شائع ہونے لگے۔ مزاح مجتبیٰ حسین کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ گھر' دفتر' سیاست اور محفل احباب ہر جگہ شوخ وشنگ مجتبیٰ اپنی گل افشانی گفتار کے ذریعہ مزاح کی دولت لٹاتے رہے۔ تحسین وستائش کے خوش گوار ماحول میں مجتبیٰ حسین اپنے تخلیق کردہ کالموں پر نئی منزلیں تعمیر کرتے گئے۔ انشائیے' خاکے' سفرنامے' تعارف نامے'

دیباچے، کتابوں پر رائے، استقبالیہ و صدارتی خطبے، رپورتاژ، محفلوں کی روداد، ملاقاتوں کا حال، سیاسی تبصرے، رزم و بزم کی داستانیں، یہاں تک کہ تعزیت نامے اور بجز فکشن (ویسے مجتبیٰ حسین کے فن مزاح کی ترکیب و تہذیب میں مبالغہ کی ہلکی آنچ کے ساتھ فکشن کے بنیادی اور ترکیبی عناصر کارفرما نظر آتے ہیں) نثری اظہار کے جتنے پیرائے ہوسکتے ہیں، سب ہی میں مزاح کی چاشنی گھول دی۔ بات سے بات پیدا کرنے کی بات غالبؔ سے چلی لیکن آج مجتبیٰ حسین کی تحریریں اس کی بہترین مثال ہیں۔

مجتبیٰ حسین بلاشبہ اردو کے مقبول ترین مزاح نگار ہیں۔ ان کے مضامین نثری محفلوں میں مکرر دوبارہ ارشاد کی صداؤں اور فرمائشوں کے ساتھ شعر کی طرح سنے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مزاح کے وقار کو بلند کیا۔ ادبی رجحان سے زیادہ مزاح کو ایک الگ صنف یا شعبہ کی حیثیت سے منوانے کے لیے بھی وہ ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے خاکہ نگاری کے فن میں بھی اپنے لیے ایک منفرد جگہ بنائی ہے۔ ان کے خاکوں میں ممدوح کے ساتھ خاکہ نگار کا کردار بھی سایہ کی طرح لگا رہتا ہے۔

بڑا مزاح نگار خالص مزاح کے سہارے کبھی آگے بڑھ نہیں سکتا۔ ادھر چند سال سے مجتبیٰ حسین کی تحریروں پر طنز حاوی ہوتا جارہا ہے۔ ان کا ہر پیکر تحریر طنز کے ہلکے رنگوں میں ملبوس نظر آتا ہے۔ طنز کی یہ زیریں لہر مزاح کی ادبی شان میں اضافہ کا باعث ہے۔ خاص طور سے وہ اپنے مضامین کے آخری پیراگراف میں (جسے چاہیں کلائمکس کہہ لیں) طنز کے کاری وار کے ذریعہ مزاح کو ایک ڈرامائی موڑ دیتے ہیں۔ قاری مجتبیٰ کے ایک ایک لفظ سے اتفاق کرتا ہے اور اگر وہ مضمون سن رہا ہو تو آخری تالیاں بجا بجا کر مزاح نگار کے خیالات میں خود کو شریک کرتا ہے اور یہی ایک تخلیق کار کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔۔۔۔ (سوینئر جشن مزاح۔ دبئی)

سید رحمت علی

☆ مجتبیٰ حسین کے بارے میں ایک اہم بات عرض کردوں کہ یہ اپنی زندگی کم جیتا ہے اور اپنے دوستوں کی زندگی زیادہ جیتا ہے۔ ہر دم دوستوں کے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ کوئی دوست پریشان ہو تو مجتبیٰ اس سے زیادہ پریشان ہوجاتا ہے۔ دوستوں کے طرح طرح کے کام

کرتا ہے۔ اس کی ساری زندگی سوشل سروس میں گزرتی ہے۔ مجتبیٰ حسین دن بھر دوستوں کے کام میں مصروف رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسے احساس ہوا ہے کہ خودغرضوں کی اس دنیا میں وہ بیوقوف بن رہا ہے لیکن اس احساس کے باوجود وہ اپنی بے وقوفی کو ترک نہیں کرتا بلکہ خود اپنے بے وقوف بننے کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے---------------------------(ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

جے پال نانگیا

☆ جس دن مجتبیٰ حسین نے کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض سنبھالے، اسی دن سے انہوں نے اردو مطبوعات کی اشاعت کے سارے مسائل، اعلا سطح کی میٹنگ کے لیے مواد کی تیاری اور مرکزی وزارت تعلیم سے رابطہ قائم رکھنے کی ساری ذمہ داریاں میرے ہاتھوں سے لے لیں۔ اُردو کتابوں کا جو پروجیکٹ دو برسوں سے لیت ولعل میں پڑا ہوا تھا، اس میں اچانک ایک نئی جان سی پیدا ہوگئی اور اُردو کتابوں کی اشاعت کا کام زور و شور کے ساتھ شروع ہوگیا۔ مجتبیٰ حسین نے حضرت امیر خسرو کے بارے میں جو پہلی کتاب این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کی جانب سے شائع کی، اُسے ڈی اے وی پی کے قومی مقابلے میں پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں پبلی کیشنز ڈپارٹمنٹ کے اُردو شعبہ نے عظیم الشان اور حیرت ناک کارنامہ انجام دیا یعنی تین مہینے کے اندر اس شعبہ نے اُردو کی تیس نصابی کتابیں شائع کردیں۔ گویا کونسل نے ہر تیسرے دن میں ایک اردو کتاب چھاپنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کردکھایا۔ آج این۔سی۔ای۔آر۔ٹی پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک ۱۰۵ نصابی کتابیں شائع کرچکی ہے جن میں سے بیشتر کے کئی کئی ایڈیشن اب تک شائع ہوچکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ابتداء میں مجتبیٰ حسین کو میں صرف ایک مخلص اور قابل عہدہ دار کی حیثیت سے جانتا تھا لیکن جوں جوں ان سے میرا ربط بڑھنے لگا تو مجھے ایک اردو ادیب کی حیثیت سے ادب میں ان کی بے پناہ مقبولیت اور اہمیت کا بھی احساس ہونے لگا۔

(ماہنامہ شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر)

ڈاکٹر انور پاشا

☆ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو طنز و مزاح کی روایت کو پروان چڑھانے والوں میں مجتبیٰ حسین کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی ذہانت اور سماجی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے عہد کی بدلتی اور مسخ ہوتی قدروں کو طنز و مزاح کا موضوع بنا کر جس بے باکی اور دیانت داری سے اپنے عہد کی سرزنش کی ہے' وہ ان کی فن کارانہ عظمت کی دلیل ہے۔ زندگی اور معاشرے کی معمولی سے معمولی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو اپنی گرفت میں لے کر ان کے حوالے سے بڑے معنی خیز اشارے کرنا اور لطیف پیرائے میں تلخ سے تلخ تجربوں اور مشاہدوں کو قاری کے احساس و فکر کی گہرائیوں میں اُتارنا مجتبیٰ حسین کا وصف خاص ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا اور اپنے طرز اظہار سے قاری کو مسحور کر کے آہستہ آہستہ اسے زندگی کی زہرناکیوں اور سفاکیوں سے آشنا کرانے اور اسے خود اپنی حماقتوں سے دوبدو ہونے کا حوصلہ عطا کرنے کا فن مجتبیٰ حسین کو خوب آتا ہے۔ اسلوب بیان میں بذلہ سنجی اور رعایت لفظی کے عناصر ان کی تحریروں کو دو آتشہ بناتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا عہد خواب گری کی بجائے شکست خواب کا عہد رہا ہے اور شکست خواب کے اس پر آشوب عہد میں سماجی' سیاسی' اخلاقی اور تہذیبی قدروں کے زوال نے جو ہمہ جہت بحران پیدا کیا' اس نے زندگی اور انسانیت پر سے ہی ایقان کو متزلزل کر دیا۔ ایسے حالات میں زندگی کی زہرناکیوں اور تلخ و برہنہ حقیقتوں کو فن کے پیکر میں ڈھال کر معاشرے کو تعمیری و مثبت فکر و نظر سے آشنا کرنا حساس اور ذمہ دار فن کاروں کے لیے ایک چیلنج تھا۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے عہد کے دیگر حساس' اہل بصیرت اور ذمہ دار فن کاروں کی طرح اس چیلنج کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی ذمہ داری کو بہ خوبی ادا بھی کیا ہے اور یہی ذمہ ان کی تحریروں کو سوقیانہ پن' لفظی شعبدہ بازی اور سطحی پن سے ممیّز کرتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ظرافت ابتذال کی بجائے شائستگی و سنجیدگی کی دعوت دیتی ہے اور طنز کا نشتر قاری کے ذہن و افکار کو بیدار کر کے اس کے ذوق جمال کو تعمیری سمت عطا کرتا ہے۔ ________________ (حسن مثنیٰ کے نام ایک خط)

حسن چشتی

مجتبیٰ حسین کا اسلوب نگارش اس کا اپنا ہے۔ وہ آسان اور دل میں اتر جانے والی ایسی

زبان لکھتا ہے جس سے خود زبان کی وسعت، ہمہ گیری اور قوت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں کہیں تکلف اور تصنع، آورد یا آرائش اور زیبائش کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اس کا مشاہدہ وسیع بھی ہے، گہرا بھی، وہ ایک صوفی کی طرح اپنی تحریروں میں بے ہمہ بھی باہمہ بھی۔ وہ ہمیں اور آپ کو اپنے شخصی تجربات میں بھی ایسی سہولت سے شریک کر لیتا ہے کہ اس کے جذبات و احساسات ہمیں اپنے ہی محسوس ہوتے ہیں۔ اسی کو بلاغت کی اصطلاح میں سہل ممتنع کہا گیا ہے کہ دیکھنے میں بہت سہل اور سبک معلوم ہو، لکھنے بیٹھیں تو بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیں۔ غالب نے اسی کیفیت کو یوں کہا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نہ اس کے لفظوں کا خزانہ کم ہوتا ہے، نہ ان کی تاثیر و تاثر میں کمی آتی ہے۔ نہ خیالات کی بے جا تکرار ہوتی ہے، نہ ترسیل میں کوئی کمی رہتی ہے۔ وہ معمولی سے موضوع کو غیر معمولی اور غیر معمولی کو نہایت معمولی بنانے کا فن بھی جانتا ہے۔ (دیباچہ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں)

ڈاکٹر انور سدید

☆ مجتبیٰ حسین شاید ہمارے عہد کے واحد مزاح نگار ہیں جن کی ظرافت پر ''جرم ستم ظریفی'' کی پھبی نہیں کسی جاسکتی۔ دوسری طرف ہمارے ہاں تو ایسے ایسے مزاح نگار بھی موجود ہیں جو شیدا پہلوان کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ قاری اگر داد نہ دے تو شیدا پہلوان کلاشنکوف نکال کر ڈز، ڈز، ڈز کرنے لگتا ہے اور قاری کی بتیسی مزاح نگار کی طرح خود بہ خود نکل آتی ہے بلکہ ایسی نکلتی ہے کہ پھر سے قبر میں دبانا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں۔ وہ کلاشنکوف کے بغیر قلم ہی استعمال کرتے ہیں اور قاری کے لبوں پر کبھی ایک لطیف سا تبسم اور کبھی ایک بلند آہنگ قہقہہ بکھیر دیتے ہیں اور خوبی یہ کہ مجتبیٰ حسین یہ بات بالکل باور نہیں کراتے کہ وہ مزاح تخلیق کر رہے ہیں-------- (سوئیر جشن مجتبیٰ حسین، دوبئی)

ضمیر جعفری

☆ مجتبیٰ حسین نے اس صدی کے آشوب کو ملائم کرنے اور قابل برداشت بنانے میں عہد آفریں حصہ لیا ہے۔ اردو کے مزاجیہ ادب کے حوالے سے ہم پاکستانیوں کے لیے سارا ہندوستان اب صرف دو افراد کے قدموں میں سمٹ کر رہ گیا ہے اور وہ ہیں مجتبیٰ حسین اور

یوسف ناظم۔ مجتبیٰ حسین ان لکھنے والوں میں سے ہیں جو خیال کی گیرائی اور انشائی بانکپن کی آمیزش سے اپنا ایک علاحدہ تشخص ہی نہیں بلکہ ایک مستقل دور پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک بلیغ بشاشت اور فکر مند شگفتگی ان کے فن کی خصوصی اساس ہے۔ (سوئیئر جشن مجتبیٰ حسین، دوبئ)

Mohammad Ali Siddique

Mujtaba writes humour without peddling a lot of pretentions coverings to make his writings weighty. He does not believe in living on borrowed brillance like most of our humourists. I believe that only those writers can write humour who believe in change, in the forward march of historical forces. Anyone trying to create laughter over modernity itself destined to be a failure because he would be ridiculing the dictates of time. It is like negating life without realising that the more one heaps ridicules on life the more one makes a fool oneself.

Mujtaba hussain's humour springs from the realisation that there is nothing wrong with being in the eyes of the righteous. Mujtaba believe that humour writing involves an appointment with truth. It can not be just flirtation but a life long abiding communication.

The Dawn, karachi 10/6/88

خواجہ اکرام

☆ادب کی تمام اصناف میں مزاح نگاری مشکل ترین فن ہے۔ یوں تو ادب کی تخلیق بذات خود 'کارے دارد' کی مصداق ہے مگر بفضل قادر مطلق ہمارے یہاں قحط الرجال نہیں۔ چناں چہ تخلیقی ذہن رکھنے والوں کی طویل فہرست موجود ہے۔ یہ ہمارے ملک کے لیے بھی اور ادب کے لیے بھی نیک شگون ہے۔ مگر تخلیقی ذہن کے دھارے عموماً شاعری یا فکشن کی طرف ہی بہتے نظر آرہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طنز و مزاح 'بذلہ سنجی اور ظرافت کے چشمے سوکھتے نظر آرہے ہیں۔ اگر آپ شاعروں یا فکشن نگاروں کا شمار کرنا چاہیں تو فرصت کے اوقات درکار ہوں گے مگر مزاح نگاروں کو شمار کرنا چاہیں تو انگلیاں کافی ہوں گی۔ تخلیقی ادب کے مختلف ادوار میں ایک دو ہی صاحب قلم ایسے ہیں جنہوں نے اس میدانِ خارزار میں قدم رکھا۔ موجودہ عہد میں بھی یہی صورت حال ہے۔ رشید احمد صدیقی اور ان کے ہم عصروں کے بعد بڑے نام اگر گنانا چاہیں تو مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین جیسے نام ہی سامنے آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طنز و مزاح میں

مکمل فن کاری درکار ہوتی ہے۔زبان پر ملکہ بنیادی ضرورت ہے۔ یہاں زبان و بیان سے ہی تخلیق کی کرشمہ سازیاں سامنے آتی ہیں مگر یہ جلوہ سامانیاں فکر اور مطالعہ کائنات کی محتاج ہوتی ہیں۔ چناں چہ ذہن جتنا بلند اور زبان پر جتنی قدرت ہوگی' فن اسی قدر نکھر کر سامنے آئے گا۔مجتبیٰ حسین کے یہاں یہ دونوں صفات موجود ہیں۔انہوں نے اپنی تحریروں میں زبان کے جادو سے بھی کام لیا ہے اور اپنے مشاہدات اور تجربات کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔کالم نگاری سے انہوں نے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا اور مضامین' خاکے' سفرنامے اور مزاحیہ تحریریں ان کی شناخت بن گئیں۔مجتبیٰ حسین نے طنز کے مقابلے مزاح کو اپنا آلۂ کار بنایا اور مزاح نگاری ہی ان کی تحریروں کا امتیاز ہے۔ان کی نگارشات میں فکر وخیال کی گیرائی وگہرائی کے باوصف اسلوب کی شگفتگی اور شیفتگی جابجا جلوہ گر نظر آتی ہے۔ان کے یہاں تکرار کا عمل مفقود ہے۔اس لیے ہر تحریر میں قاری کے لیے لطف وانبساط مہیا کراتی ہے------(حسن مثنیٰ کے نام ایک خط)

ڈاکٹر اجمل نیازی

☆ خاکہ نگار تو اندر اور باہر سے ایسا آدمی تلاش کرتا ہے جس سے مل کر آدمی خود سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اچھا یہ میں ہوں اور وہ اس سے انکار بھی نہیں کرسکتا۔ایک کمال کی بات ہے' مجتبیٰ کے خاکوں میں کہ وہ اپنے ''مخلوک'' میں کوئی نہ کوئی مزاحیہ خصلت نکال لیتے ہیں' باطن کے علاوہ ظاہر بھی مختلف طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اصل کام یہ ہے کہ آدمی کے اندر کے آدمی کو باہر لایا جائے۔اسے کھینچ کھانچ کے باہر لانا نقادوں کا کام ہے۔بہلا پھسلا کر باہر بلا کے لانا خاکہ نگار کا وصف ہے۔مجتبیٰ کی اس چال کو ڈاکہ بھی کہا جاسکتا ہے۔حضرت علی نے کہا تھا کہ کائنات عالم اکبر ہے اور ہر انسان عالم اصغر ہے۔ممتاز مفتی نے اپنے خاکوں میں حضرت علی کے اس قول کی تائید کی ہے۔مگر اس نے کچھ لوگوں کے عالم اصغر کو عالم اکبر بنادیا ہے۔مجتبیٰ حسین نے ان لوگوں کو ان کے اپنے جہان میں لا کھڑا کیا ہے--------(سوینئر جشن مجتبیٰ حسین)

اسد رضا

☆ مجتبیٰ حسین نے اپنے سفرناموں میں طنز کے تیر بھی چلائے ہیں' مزاح کے پھول بھی برسائے ہیں اور کہیں کہیں اوہ انتہائی جذباتی بھی ہوگئے ہیں۔اس طرح ان کے یہ سفرنامے قہقہوں' مسکراہٹوں اور اشکوں کا ایک حسین امتزاج تو ہیں ہی' ادبی' ثقافتی' سماجی اور جغرافیائی اہمیت کے حامل بھی ہیں----------------(تبصرہ راشٹریہ سہارا' نئی دہلی)

☆☆☆

مجتبیٰ حسین اکتوبر ۱۹۶۶ء

مجتبیٰ حسین مشہور صحافی احسن علی مرزا کے ساتھ ۱۹۷۱ء

فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین
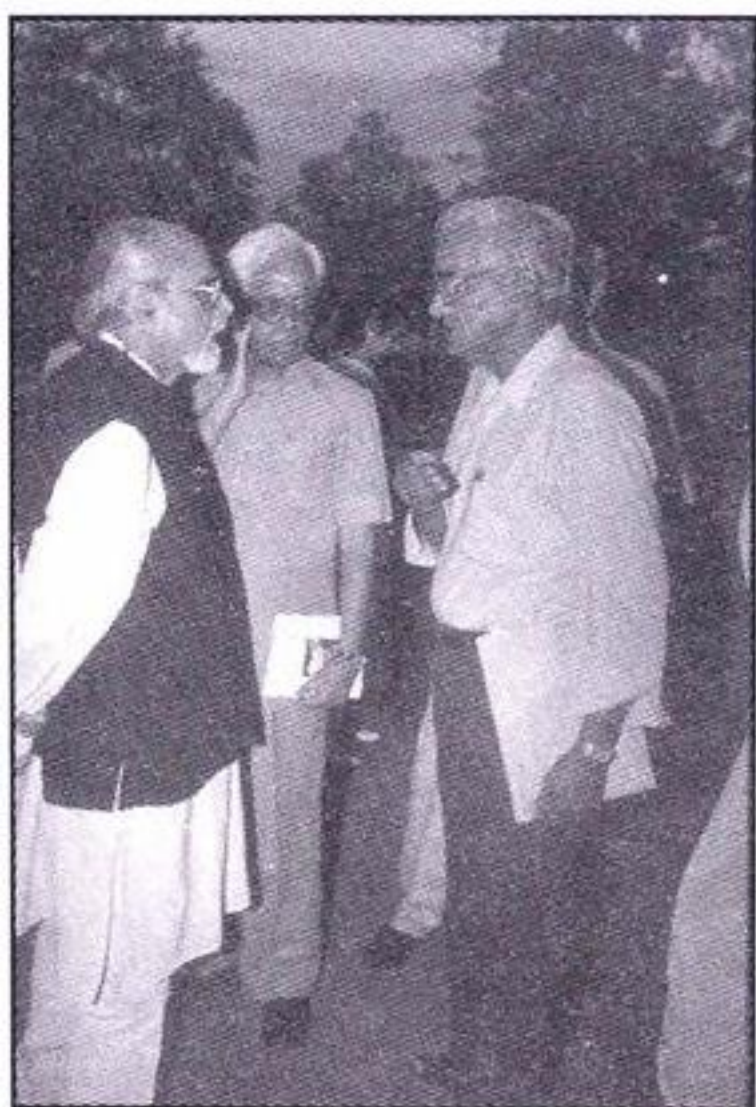
وزیراعظم ہند اندر کمار گجرال کے ساتھ کسی سنجیدہ موضوع پر محوِ گفتگو

مشہور مزاحیہ شاعر رضا نقوی واہی اور مجتبیٰ حسین
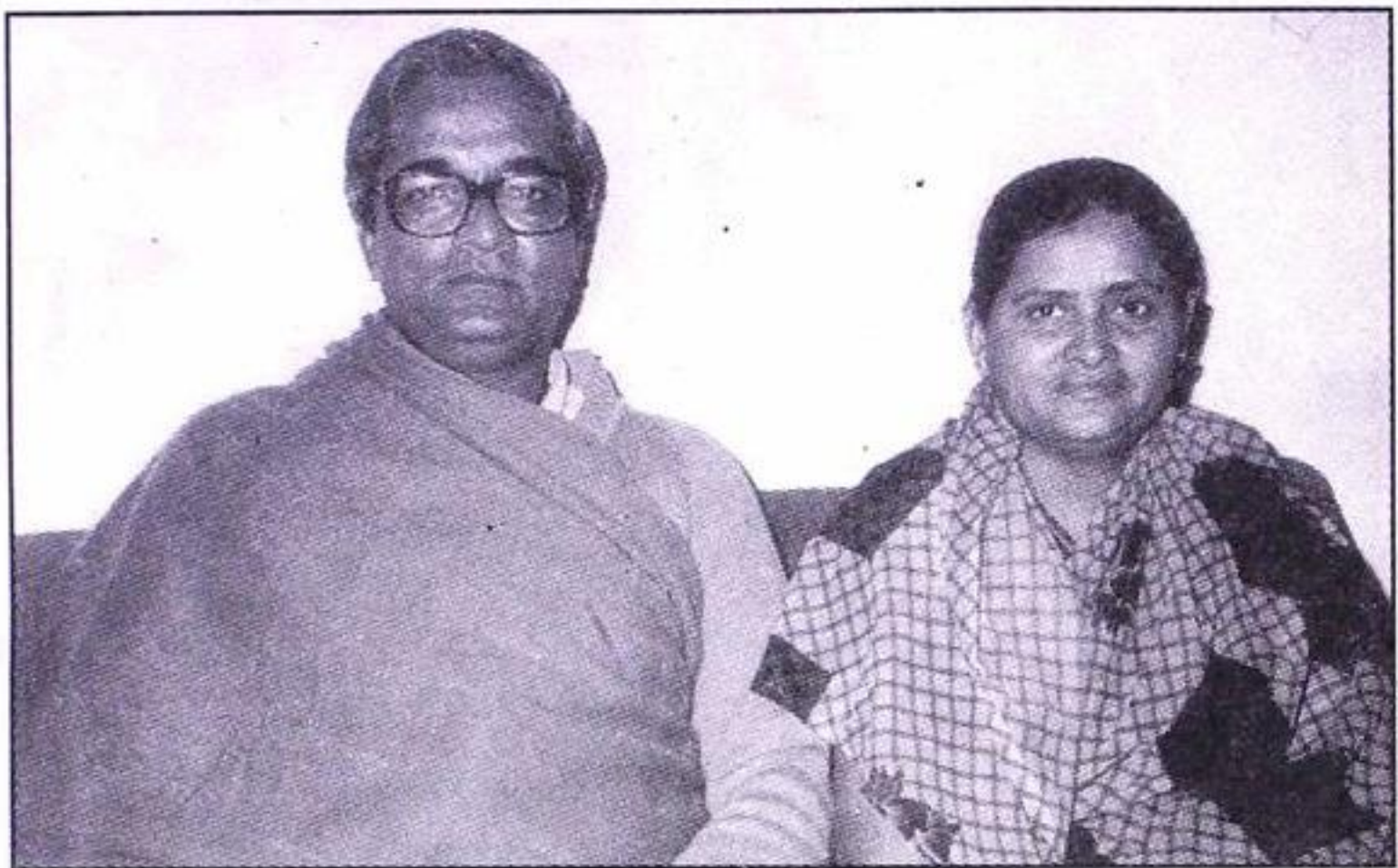
مجتبیٰ حسین اپنی شریک حیات کے ہمراہ

مجتبیٰ حسین اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے ساتھ

مجتبیٰ حسین غالب اکیڈمی میں مزاحیہ خاکہ سناتے ہوئے۔

پیرس میں ایفل ٹاور کے سامنے ۱۹۸ء
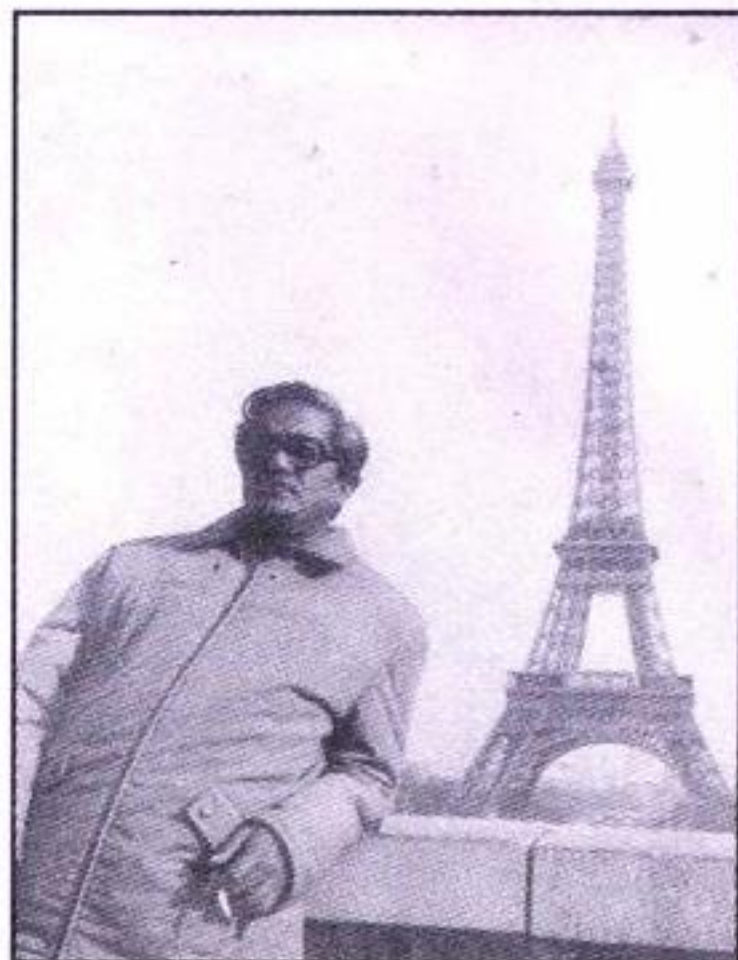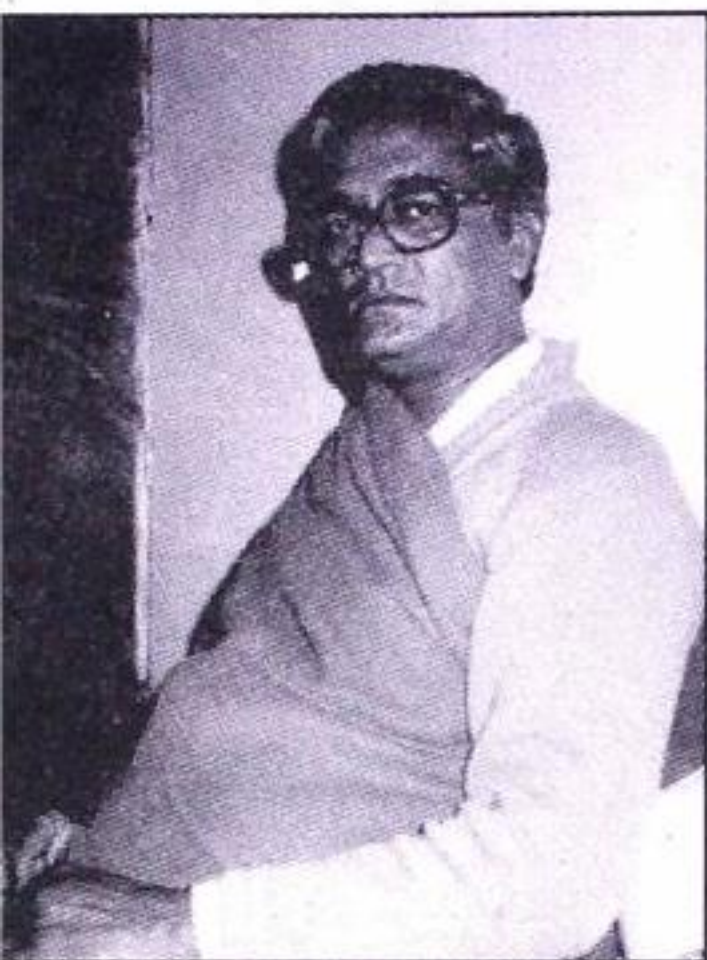
مجتبیٰ حسین........فائل فوٹو ۱۹۸۵ء

عالمی مزاح کانفرنس حیدرآباد میں سامعین کے روبرو۔ (۱۹۸۵ء

مجتبیٰ حسین........فائل فوٹو ۱۹۹۸ء

مجتبیٰ حسین مختلف انداز میں
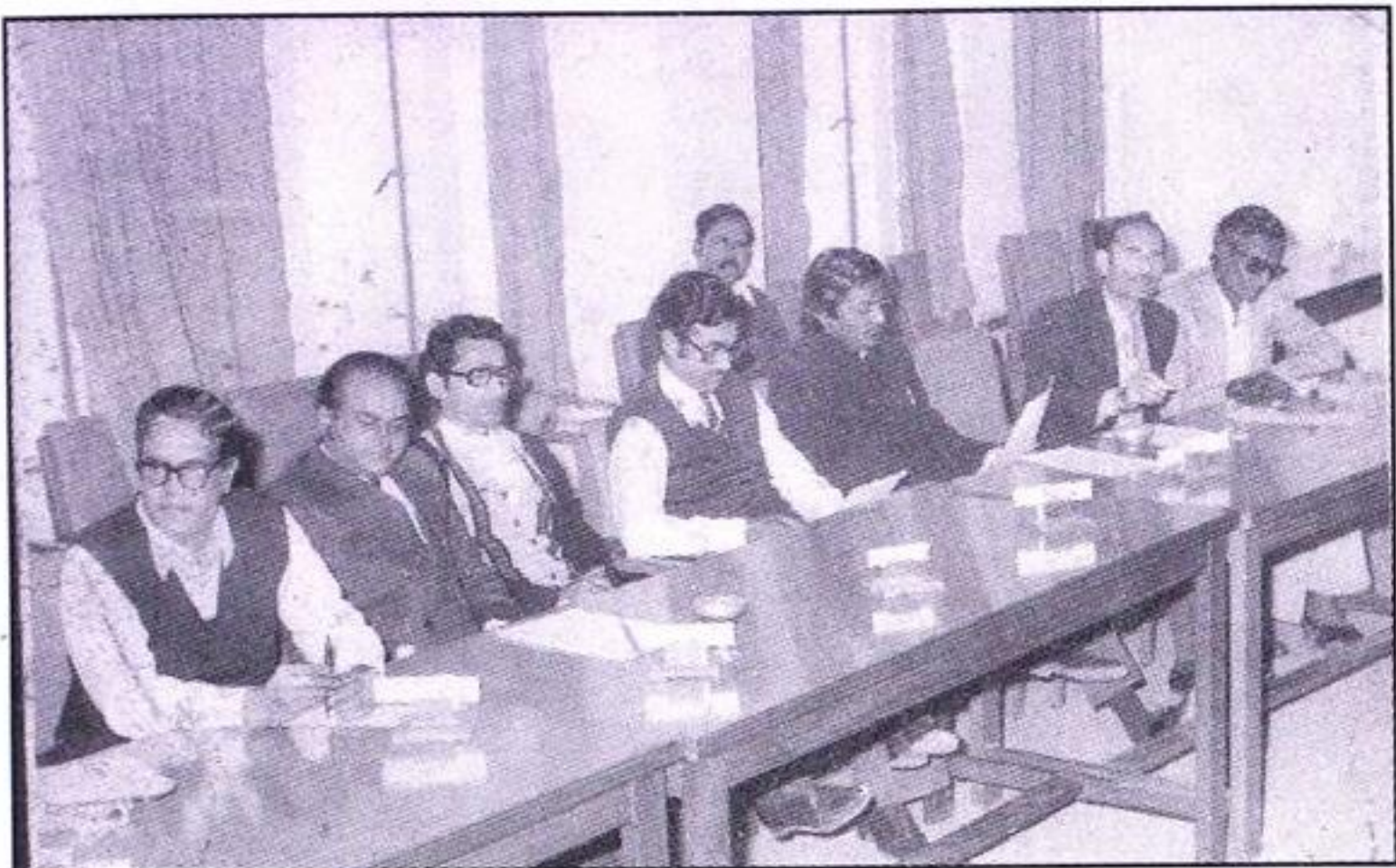
این سی ای آر ٹی کی ایک میٹنگ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ۱۹۷۵ء

۱۹۸۰ء میں کٹک میں باسیہ رتن کا خطاب پانے کے بعد اڑیا زبان کے ممتاز مزاح نگار فتور آنند کے ساتھ تصویر میں ناظم مرزائی، پاگل عادل آبادی، بوگس حیدرآبادی اور اسماعیل آذر بھی نظر آ رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین، نفیس خاں، اودے پرتاپ سنگھ، رکن پارلیمنٹ ایک محفل میں۔

یونیسکو کے ثقافتی مرکز کے ایڈیٹر جنرل یوجی اتو سے سند امتیاز حاصل کرتے ہوئے ۱۹۸۰ء
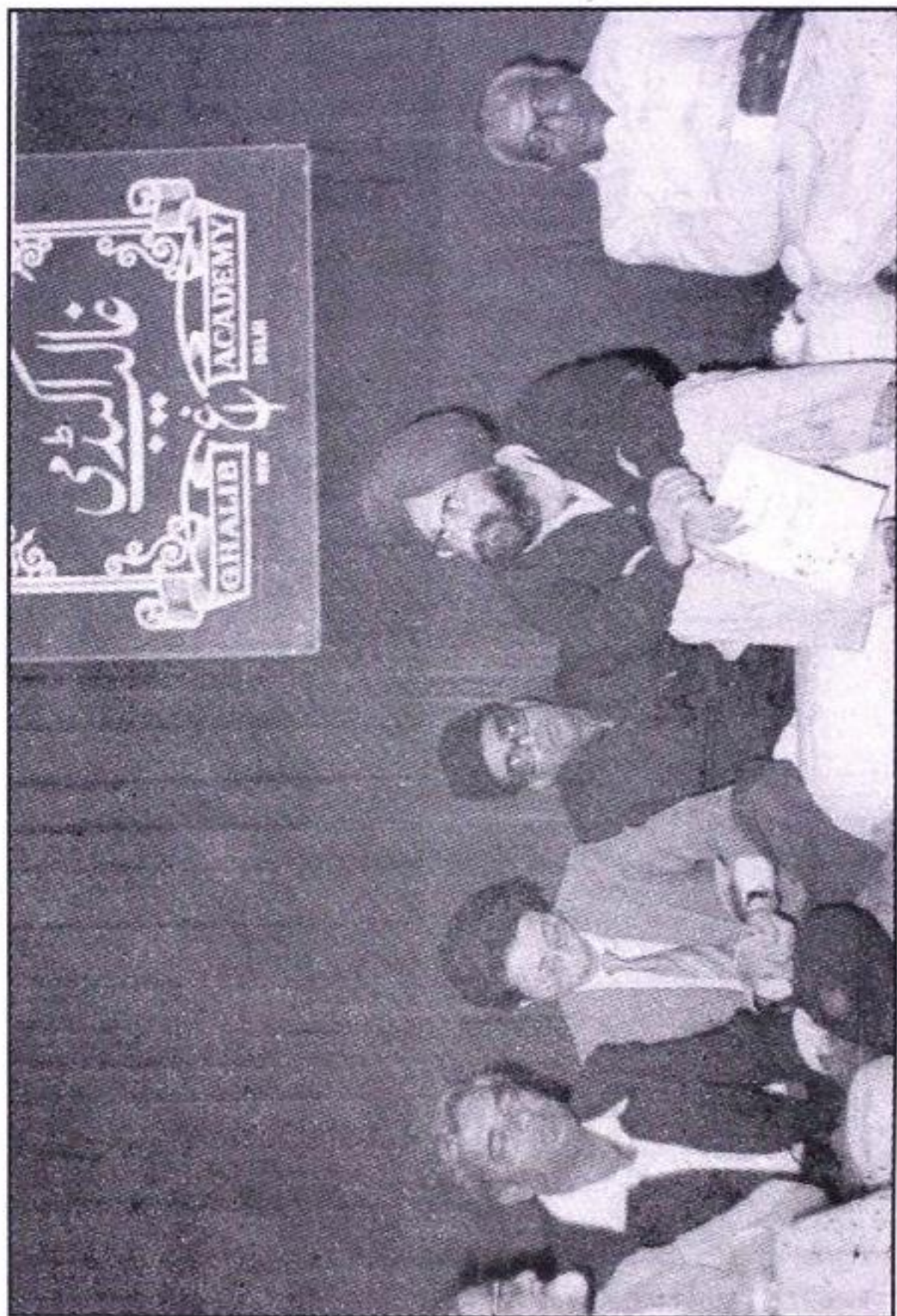
۱۹۸۳ء میں سفرنامہ جاپان چلو، جاپان چلو کی رسم اجراء کے موقع پر بائیں سے سابق مرکزی وزیر شیو شنکر، خشونت سنگھ، رحمت علی، فرسٹ سکریٹری سفارتخانہ جاپان یو جواو کانو، مجتبیٰ حسین اور عمیق حنفی۔

۶/ جولائی ۱۹۸۴ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں غالب پہلا انعام برائے طنز و مزاح حاصل کرتے ہوئے۔ تصویر میں سابق گورنر وزیر شفیع قریشی بھی نظر آرہے ہیں۔

لندن میں مشتاق احمد یوسفی کے دولتکدہ پر ایک تقریب میں (دائیں سے) افتخار عارف، معین الدین شاہ، مشتاق احمد یوسفی، مغنی تبسم، مجتبیٰ حسین، نقی تنویر، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب ۱۹۸۴ء

مجتبیٰ حسین یوسف ناظم اور رحمٰن نیر ایک ادبی محفل میں۔

وزیراعظم ہنداندر کمار گجرال اور صدر جمہوریہ کرشن کانت کے ساتھ ایک تقریب میں

شہریار اور مجتبیٰ حسین

۱۹۹۰ء میں شنکر دیال شرما کے ذریعہ انعام حاصل کرتے ہوئے۔

لندن کی ایک محفل میں (بائیں سے) مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، پرنس مفخم جاہ، افتخار عارف اور حبیب حیدرآبادی (۱۹۸۴ء)
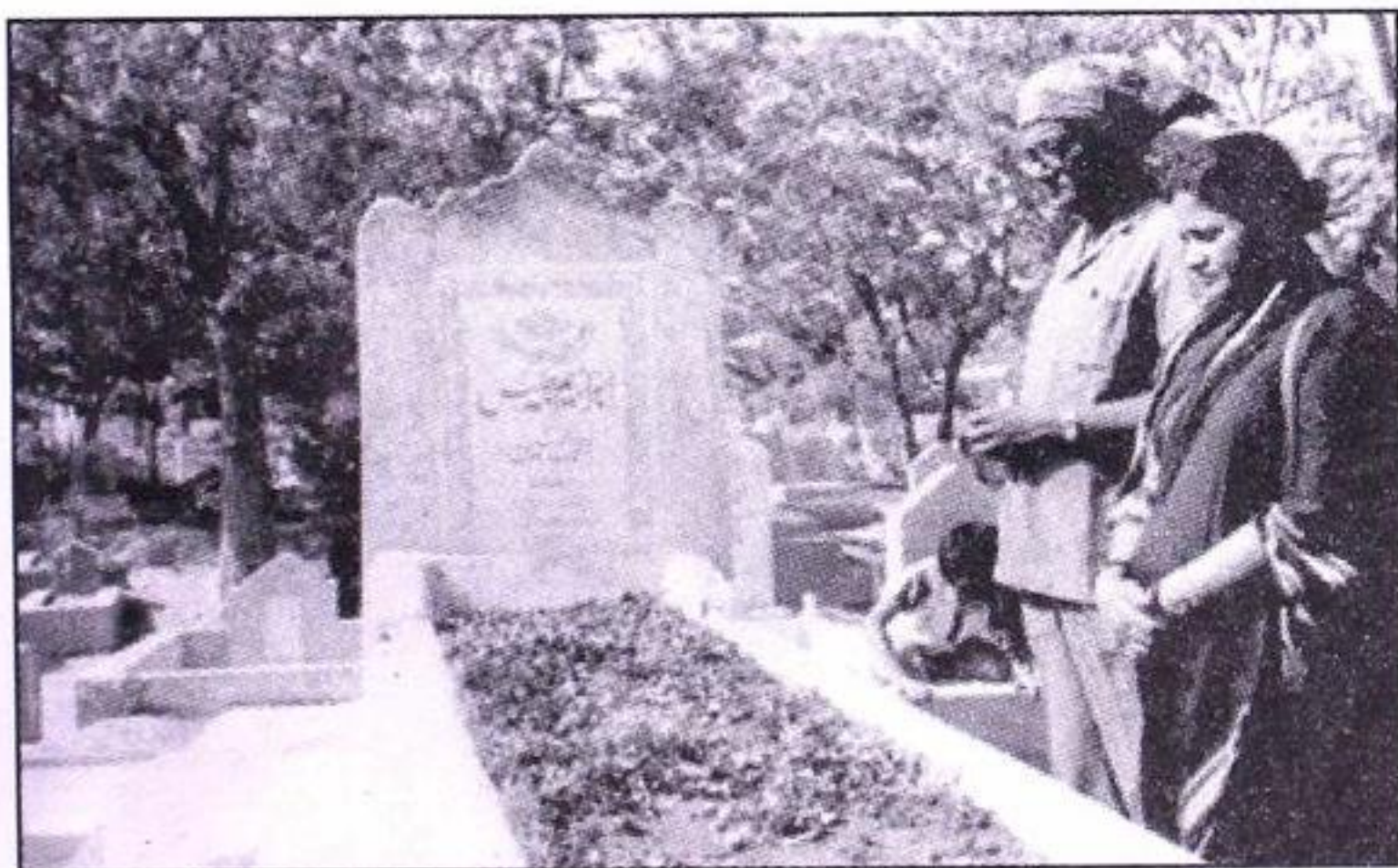
کراچی میں اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیسؔ مرحوم کی قبر پر اپنی بیگم کے ہمراہ فاتحہ پڑھتے ہوئے (۱۹۸۷ء)

لاس اینجلس کی محفل میں (دائیں سے) پروفیسر گیان چند جین، حسن چشتی، موسیقار نوشاد، مجتبیٰ حسین اور نوشی گیلانی (۲۰۰۰ء)

کراچی میں جمیل الدین عالی اور بیگم جمیل الدین عالی کے ساتھ مجتبیٰ حسین اور بیگم مجتبیٰ حسین
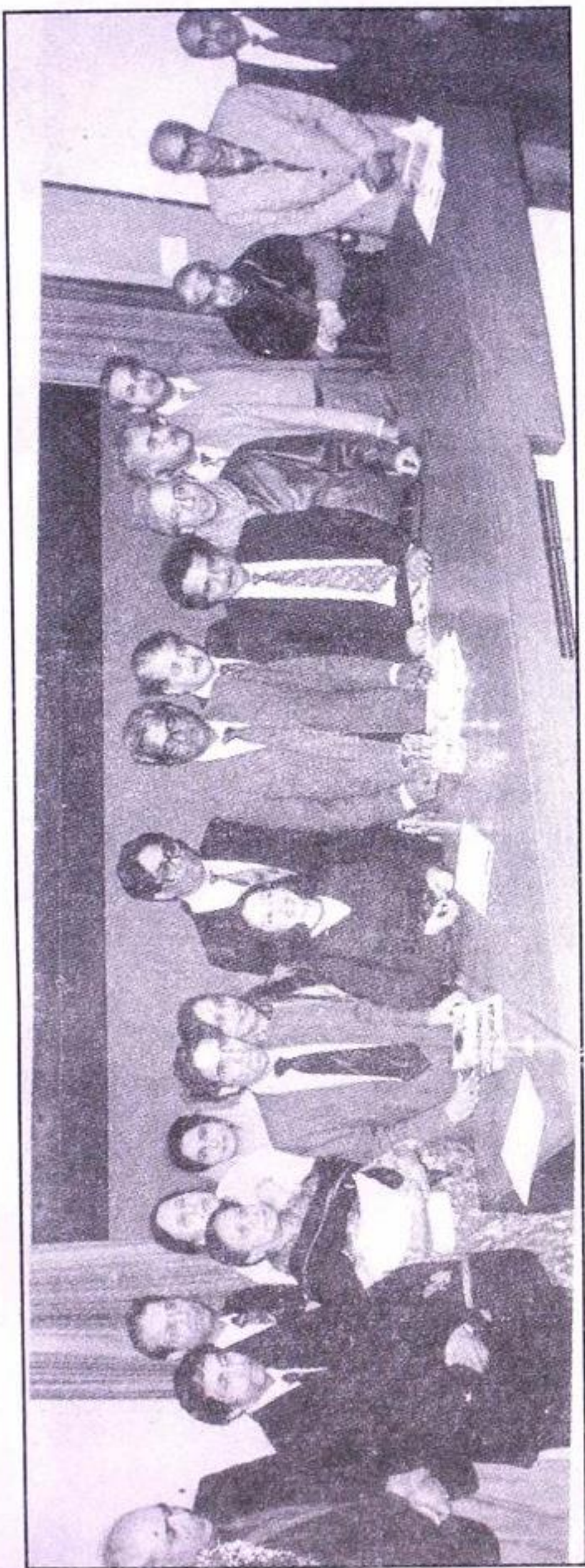
لندن کی تقریب میں (بائیں سے) پروفیسر حسن عسکری، عباس زیدی، نقی تنویر، چاند کرن، افتخاری عارف، مجتبیٰ حسین، بیرسٹر یزدانی، وقار لطیف، ساقی فاروقی، رضا علی عابدی، ضیاء الدین شکیب، زبیدہ یٰسین علی خاں اور نواب یٰسین علی خاں وغیرہ لندن میں مجتبیٰ حسین کو دیئے گئے استقبالیہ تقریب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں فیض احمد فیض کے خیر مقدم کے بعد دائیں سے پروفیسر نامور سنگھ، ڈاکٹر محمد حسن، فیض احمد فیض، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر نصیر احمد خاں اور دیگر

کتابیات

مصنف کا نام	تصنیف وتالیف	مقام اشاعت وسن اشاعت
۱۔آل احمد سرور	تنقید کیا ہے	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی ۱۹۸۲ء
۲۔ابن اسمٰعیل	اردو طنز ومزاح۔احتساب وانتخاب	گلشن پبلشر ریسرچ سری نگر، دسمبر ۱۹۸۸ء
۳۔احمد جمال پاشا	ظرافت اور تنقید	اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نشاط افزا سیوان ۱۹۸۹ء
۴۔احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	ادارہ فروغ اردو، لکھنو ۱۹۷۷ء
۵۔خواجہ عبدالغفور	طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی جون ۱۹۸۳ء
۶۔رشید احمد صدیقی	طنزیات ومضحکات	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی اگست ۱۹۷۳ء
۷۔ایضا	خنداں	ایضا ایضا مارچ ۱۹۸۸ء
۸۔ایضا	گنج ہائے گراں مایہ	کراچی، دسمبر ۱۹۹۱ء
۹۔سید اقبال قادری	رہبر اخبار نویسی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی مارچ ۱۹۸۹ء
۱۰۔شکیل الرحمن	مجتبیٰ حسین کا فن	حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدر آباد نومبر ۱۹۸۷ء
۱۱۔پروفیسر شمیم حنفی	آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ	اردو اکادمی نئی دہلی فروری ۱۹۹۱ء
۱۲۔پروفیسر نثار احمد فاروقی	دید ودریافت	آزاد کتاب گھر دہلی
۱۳۔فرقت کاکوری	اردو میں طنز وظرافت	ادارہ فروغ اردو، لکھنو
۱۴۔مجتبیٰ حسین	تکلف برطرف	نیشنل بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۶۸ء
۱۵۔مشتاق احمد یوسفی	آب گم	کتاب والا دہلی ۱۹۹۳ء
۱۶۔ایضاً	زرگزشت	حیدر آباد ۱۹۸۹ء
۱۷۔ایضاً	خاکم بہ دہن	کلکتہ ۱۹۱۸ء
۱۸۔ایضاً	چراغ تلے	کتاب والا دہلی ۱۹۹۷ء

۱۹۔ محمد خان	بجنگ آمد	کتاب والا' دہلی ۱۹۹۲ء
۲۰۔ ایضاً	بہ سلامت روی	کتاب والا' دہلی ۱۹۹۲ء
۲۱۔ ایضاً	بزم آرائیاں	کتاب والا' دہلی ۱۹۹۲ء
۲۲۔ مجنوں گورکھپوری	ادب اور زندگی	ایجوکیشنل بک ہاؤس' علی گڑھ ۱۹۸۸ء
۲۳۔ ایضا	قطع کلام	نیشنل بک ڈپو' حیدرآباد ۱۹۶۹ء
۲۴۔ ایضاً	قصہ مختصر	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد ۱۹۷۲ء
۲۵۔ ایضاً	بہرحال	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد ۱۹۷۴ء
۲۶۔ ایضاً	آدمی نامہ (خاکے)	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد ۱۹۸۲ء
۲۷۔ ایضاً	بالآخر	حسامی بک ڈپو حیدرآباد' ۱۹۸۲ء
۲۸۔ ایضاً	جاپان چلو' جاپان چلو (سفرنامہ)	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' ۱۹۸۳ء
۲۹۔ ایضاً	الغرض	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' ۱۹۸۷ء
۳۰۔ ایضاً	سو ہے وہ بھی ہے آدمی (خاکے)	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' ۱۹۸۷ء
۳۱۔ ایضاً	چہرہ در چہرہ	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' ۱۹۹۳ء
۳۲۔ ایضاً	سفر لخت لخت (سفرنامہ)	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' ۱۹۹۵ء
۳۳۔ ایضاً	آخرکار	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' نئی دہلی ۱۹۹۸ء
۳۴۔ ایضاً	میرا کالم	حسامی بک ڈپو' حیدرآباد' ۱۹۹۹ء
۳۵۔ سلیمان اطہر جاوید	تنقیدی افکار	حیدرآباد ۱۹۷۷ء
۳۶۔ ڈاکٹر طیبہ نقوی	اردو ادب میں نثری تاریخ	مرکزی پرنٹرز' دہلی ۱۹۸۹ء
۳۷۔ طارق سعید	اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۶ء
۳۸۔ ڈاکٹر مظفر حنفی	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح	اردو اکادمی دہلی مارچ ۱۹۹۰ء
۳۹۔ منظر عباس نقوی	اسلوبیاتی مطالعے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۷۹ء
۴۰۔ نامی انصاری	آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح	معیار پبلی کیشنز' دہلی دسمبر ۱۹۹۷ء

۴۱۔وزیر آغا　　اردو ادب میں طنز و مزاح　　ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ ۱۹۹۰ء

۴۲۔ہیری شا　　ڈکشنری آف لیٹریری ٹرم　　ایم سی گراہل بک کمپنی نیویارک ۱۹۷۲ء

رسائل و جرائد

۱۔ارمغاں (سہ ماہی)　ابراہیم جلیس نمبر شمارہ ۷۔۶　کراچی پاکستان

۲۔سب رس　　محبوب حسین جگر نمبر　　ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد مارچ ۱۹۹۸ء

۳۔شگوفہ جلد ۲۰　　مجتبیٰ حسین نمبر　　حیدر آباد ۱۹۸۷ء

۴۔کتاب نما خصوصی شمارہ محبوب حسین جگر شخصیت اور صحافتی خدمات، جامعہ نگر

۵۔آج کل　　طنز و مزاح نمبر (جلد اول)　　اپریل ۱۹۷۴ء

۶۔ایضاً　　ایضاً (جلد دوم)　　مئی ۱۹۷۴ء

۷۔سونیئر　　جشن مجتبیٰ حسین　　شارجہ دبئی ۱۹۹۷ء

۸۔کتاب نما (ماہنامہ)　مضامین مجتبیٰ حسین　　مکتبہ جامعہ جامعہ نگر دہلی ۱۹۹۹ء

۹۔روزنامہ 'سیاست'　　حیدر آباد

۱۰۔ہندستان ٹائمز　　نئی دہلی

۱۱۔نیا دور　　یادرفتگاں نمبر　　مارچ تا دسمبر ۱۹۸۸ء

۱۲۔صدق جدید　　عبدالماجد دریابادی

۱۳۔ساقی (طنز و ظرافت نمبر)　　---------　　۱۹۹۵ء

۱۴۔علی گڑھ میگزین (طنز و ظرافت نمبر)---------

۱۵۔نقوش (طنز و مزاح نمبر)　　---------　　لاہور ۱۹۵۹ء

۱۶۔ہم سخن (طنز و مزاح نمبر)　　---------　　جناح کالج ۸۱۔۱۹۸۲ء

☆☆☆

مصنف کی دوسری تصنیف

فن اور فنکار

جلد ہی منظر عام پر آ رہی ہے۔

☆☆☆

برصغیر ہندوپاک کے تمام مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین کا نام نہایت ہی ادب و احترام سے لیا جاتا ہے جن کی تحریریں شگفتہ، چلبلی اور قہقہہ بہ دوش ہوا کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے سیکڑوں مزاحیہ مضامین اور خاکوں کے ذریعہ فکاہی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ لطیف مزاح، شائستگی، شرافت، نیکی، اعتدال پسندی، زبان کا رچاؤ، تیکھے اور دلکش اسلوب نے انہیں ان کے تمام ہم عصروں میں ممتاز و منفرد بنادیا ہے......

مجتبیٰ حسین کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو سماج سے جوڑ کر دیکھنے کے قائل ہیں، ادب برائے سماج اور ادب برائے زندگی میں یقین رکھتے ہیں نہ کہ تخلیق برائے تخلیق اور فن برائے فن میں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تمام مضامین میں ایک قسم کی تخلیقی فضا پائی جاتی ہے۔ انہوں نے ہنسنے کو ایک مقدس فریضہ گردانا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ناگوار بلکہ نفرت آگیں حالات میں بھی ہنسنے کے مواقع فراہم کردیتے ہیں اور ہنسی کے ذریعے سماج کے ان عیوب سے پردہ اٹھادیتے ہیں جو اس جنت نشان دنیا کے چہرے پر بدنما داغ کے مثل ہے۔ ایسا کرتے وقت طنز کی نشتریت ان کا ساتھ دیتی ہے لیکن ان مواقع پر بھی وہ کسی کی تضحیک نہیں کرتے، کسی کو ہدف ملامت نہیں بناتے بلکہ طنز کرتے وقت بھی ابتذال اور پھکڑپن سے کافی دور کھڑے نظر آتے ہیں۔ جو ان کے اندر موجود شرافت، اعلا ظرفی اور اپنے ماحول و سماج سے ہمدردی وانسیت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ توڑنے میں یقین نہیں رکھتے بلکہ اصلاح کے خواہاں ہیں، ان کے یہاں ہنسی کا ایک تصور دیکھنے کو ملتا ہے جو غم کو انگیز کرلینے کے بعد ہی وجود میں آسکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ ان کے مزاحیہ مضامین کالموں، خاکوں وغیرہ کو پڑھنے کے بعد قاری نہ صرف ہنستا اور مسکراتا ہے بلکہ یہ سوچنے پر بھی مجبور نظر آتا ہے کہ سماج کے دبے کچلے، مجبور و محکوم انسانوں کو اس کے غموں، مایوسیوں اور محرومیوں سے کیسے نجات دلائی جائے۔

(اسی کتاب سے ماخوذ)

Alia Publications New Delhi - 67

aliapublications@hotmail.com